پھولوں کے محل

پھُولوں کے محل

پھولوں کے محل

صادق حسین

اِدارہ فروغِ اُردو ○ لاہور

سرورق عبدالرحمٰن چغتائی
کتابت محمد حسین خوش نویس

بار اوّل ستمبر ۱۹۶۳ء
قیمت ۵ روپے

مطبع نقوش پریس لاہور
ناشر محمد طفیل ادارہ فروغِ اُردو

زرینہ حسین کے نام

ترتیب

پونہچیاں

ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں میں فریداں نے پونہچیوں کی فرمائش
کی اور مستری خدا داد خاں نے تہیّہ کر لیا کہ وہ فریداں کی کلائیوں میں چار تولے
سونے کی دو پونہچیاں پہنا کر ہی دم لے گا۔

فریداں ایک خوبصورت بچّی کی ماں بن گئی۔

ایک عرصۂ دراز گزر گیا۔

مستری خدا داد خاں کو اپنی اکلوتی بیٹی سکینہ سے بے حد محبت تھی اور
وہ اپنی رفیقۂ زندگی فریداں پر جان چھڑکتا تھا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور
سردیوں کی برفانی ہواؤں میں وہ برسوں اینٹ گارے کی دنیا سے جنگ آزما
رہا۔ سکینہ دیکھتے ہی دیکھتے اتنی لانبی ہو گئی کہ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھڑی
ہوتی تو دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتیں۔ اب سکینہ پانی سے بھرے دو گھڑے
سر پر رکھ کر بات کی بات میں کنوئیں سے گھر پہنچ جاتی تھی۔ بھوری بھینس کی دیکھ بھال

بھی وہی کرتی ۔ چارہ ڈالتی ۔ دودھ دوہتی ۔ اسی دُودھ کی فراوانی ہی سے تو ماں بیٹیوں کے گال انگارے کی طرح سُرخ تھے اور خداداد کے بازوؤں کی طاقت جُوں کی توں قائم ۔

جب فریداں دہی کی مٹکی کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر متھانی کی ڈوری کے سرے ہاتھوں سے باری باری کھینچتی ، سل بٹے سے مسالہ پیستی ، تنور کے پاس کھڑی ہو کر روٹیاں لگاتی تو اُس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں شور مچانے لگتیں ۔ یہ شور سُن کر خداداد خاں کا چوڑا چکلا سینہ اُبھر کر آہنی دیوار بن جاتا اور اُس آہنی دیوار کے تلے صرف ایک آرزو ، صرف ایک تمنّا ، صرف ایک ارادہ کروٹیں لینے لگتا ۔ اسی ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خداداد خاں ایک مشین بن گیا تھا ۔ نور پور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے نور پور ، گرمی ہو یا سردی ، وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں کرنی اور بسولی لے کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتا اور رات کو لوٹ کر آتا ۔ بانسوں کی اُونچی پاڑ پر کھڑے ہو کر چُنائی کرتے ہوئے جب اُسے کوئی بات یاد آجاتی تو وہ ہاتھ روک کر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا ۔ نیچے سڑک پر تانگے ، لاریاں ، کاریں ، سائیکلیں رواں دواں نظر آتیں ۔ اُجلی اُجلی پوشاکیں پہنے ہوئے شہری چلتے پھرتے دکھائی دیتے ۔ ہوٹلوں اور سینماؤں سے گراموفون ریکارڈ بجتے سُنائی دیتے ۔ زیرِ تعمیر عمارت کی بلند ہوتی ہوئی دیوار سے ساہول لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ یہ سب دولت ہی کے کرشمے ہیں ۔ لیکن اُسے دھن دولت کی ضرورت نہیں ۔ اُسے تو صرف چار تولے سونا مہیا کرنا ہے ۔ اِنہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ پھر کرنی چوڑے چکلے ہاتھ کی گرفت میں لے لیتا اور پھر اُسی تیزی سے

ردّے پر ردّا رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

ہر روز کام پر جانے سے پہلے خدا آداد خاں گرم تنوری روٹی پر مکھن ڈال کر کھاتا، پھر لسّی کے دو بڑے بڑے پیالے پی کر چلم کے دو چار گہرے کش لگاتا۔ دھوئیں کے مرغولے اُڑ اُڑ کر کارنس پر رکھے ہوئے مٹی کے پیالوں، رکابیوں اور صحنکوں پر منڈلانے لگتے۔ پھر طاق پر رکھے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے جب وہ صافے کا شملہ درست کرتا تو اُس کے ماتھے پر چھوی کا ایک بڑا سا نشان عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کر دیتا۔ اُس وقت وہ جُھک کر کھڑکی سے اُس پگڈنڈی کی طرف دیکھتا جو کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی۔ وہی راستہ سید پور کو جاتا تھا۔ اُسی راستے سے وہ فریداں کو پالکی میں بٹھا کر لایا تھا۔ اُسی پگڈنڈی پر پہاڑی کی اوٹ میں اُس نے چھویوں کے وار روکے تھے۔ وہیں ایک چھوی چمک کر اُس کے ماتھے میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کرنی اور بسولی لے کر باہر نکل جاتا۔ برسوں پہلے دنداسے سے رنگے ہوئے ہونٹوں سے نکلی ہوئی کنواری فرمائش پھر اُس کے کانوں میں گونجنے لگتی اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ اُس کا ارادہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا۔

شام کے وقت کام ختم ہونے پر جب ٹھیکیدار اُجرت بانٹتا تو خدا آداد خاں کی روزانہ مزدوری سے آنہ دو آنے کاٹ لیتا اور پھر مخلصانہ انداز میں خدا آداد خاں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "یہ تمھاری امانت ہے۔ یہ پیسے کبھی تمھارے کام آئیں گے۔" اور خدا آداد خاں جو کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑنے کی فکر میں رہتا، اپنے پُرانے ٹھیکیدار کا یہ جُملہ سُن کر منہ سے کچھ نہ بولتا۔ مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا

اور پھر اپنے اوزار سنبھال کر صرافوں کے بازار کی طرف چل دیتا اور وہاں کے شوکیسوں میں سجی ہوئی پونہچیوں کو دیکھتا ہوا، ہزاروں باتیں سوچتا ہوا نورپور کی سمت نکل جاتا۔

روپیہ بڑی کاوشوں سے آہستہ آہستہ اکٹھا کیا جاتا اور پھر اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خرچ ہو جاتا۔ ہر چار چھ مہینے کے بعد کوئی نہ کوئی بپتا آن ہی پڑتی۔ بچے بچائے پیسے اُڑ جاتے۔ بات پھر از سر نو شروع ہوتی۔ اُمیدوں کی کونپلیں پھوٹنے لگتیں۔ پھر خوابوں کے محل یک بیک ڈھے پڑتے۔ زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی۔

ہر سال موسمِ بہار میں شاہ لطیف کی درگاہ پر میلہ لگتا۔ بڑی دھوم دھام سے پشاور سے چراغی آتی۔ جگہ جگہ خیمے تن جاتے۔ ملک کے گوشے گوشے سے آنے والے زائرین کا تانتا بندھ جاتا۔ چند دنوں کے لیے سارے نورپور میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ رات کے وقت، پہاڑیوں کے دامن میں، ندی کے کنارے نوری باغ میں، غرضیکہ چپّے چپّے پر پیٹرومیکس لیمپ روشن ہو جاتے۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت میں سنہری آوازوں کی تڑپ دلوں میں ہل چل مچا دیتی۔ بڑی بڑی کے نعروں سے فضائیں گونج اُٹھتیں۔ سکّوں اور نوٹوں کا مینہ برسنے لگتا۔ برسوں پہلے میلے کے دنوں ہی میں خداداد خاں نے فریداں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اُس وقت خداداد خاں کی کبڈی کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ ڈھائی من کا پتھر اُٹھا کر ہوا میں یوں پھینک دیتا تھا جیسے روئی کا گالا ہو۔ ہر سال

موسمِ بہار کا یہ میلہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کر دیتا۔ نہ جانے کیوں اُن دنوں خداداد خاں عجیب طور پر جذباتی ہو جاتا۔

ایک دن میلے کے دنوں میں، خداداد خاں جب شہر سے گھر لوٹ کر آیا تو سکینہ کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ فریداں اکیلی چٹائی پر آلتی پالتی مارے لحاف میں ڈورے ڈال رہی تھی۔ خداداد خاں اُس کے بالکل قریب بیٹھ گیا اور پھر فریداں کے کانوں میں لٹکتے ہوئے چاندی کے جُھمکوں کو اُنگلی سے چھُوتے ہوئے بولا۔ "پھر میلے کے دن آ گئے۔"

"اُوں ہوں کام کرنے دو نا۔" فریداں نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور اُس کی کلائی میں کانچ کی چُوڑیاں بج اُٹھیں۔

"پہلے ایک آلوچہ کھا لو پھر کام کرنا۔" یہ کہتے ہوئے خداداد خاں نے صافے کے کونے میں بندھے ہوئے آلوچے دھپ دھپ لحاف پر گرا دیئے اور پھر ایک آلوچہ اُٹھا کر فریداں کے منہ میں ڈال دیا۔ فریداں کے رخساروں میں گلاب کی سُرخی دوڑ گئی۔

"یہ تمھارے ماتھے پر کیا ہے؟" فریداں نے سُرمگیں آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"ایک نشانی۔"

"کس کی؟"

"سید پور کی شہزادی کی۔"

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اِتنے میں سکینہ آنگن میں داخل ہوئی۔

خدا داد خاں اُٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگا۔

اُس رات خدا آداد خاں ندی کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آہنی دیوار کے تلے دھائیں دھائیں ہونے لگی صرافوں کے بازار کے بڑے بڑے شوکیس اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور اُن شوکیسوں میں سجی ہوئی پونہچیوں کے ننھے ننھے طلائی گنبد اُبھر کر ندی کے پانی میں تیرنے لگے گوشے گوشے سے نغمہ وساز کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ آس پاس سے بڑی بڑی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ آسمان پر ماہِ کامل چمک رہا تھا۔ ایک چاند ندی کے پانی میں لرز رہا تھا۔ خدا آداد خاں نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صافے کے کونے سے خشک کر ڈالے۔ پھر وہ چھوی سنبھال کر گھر کی جانب چل دیا۔

زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی۔

آخر ایک دن خدا آداد خاں کی کائنات مسکرا اُٹھی۔ اُس دن حجازِ مقدس روانہ ہونے سے پہلے ٹھیکیدار نے پانچ سو روپے کی رقم خدا آداد کی جھولی میں ڈال دی۔

"یہ تمہاری امانت ہے۔" ٹھیکیدار نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

خدا آداد خاں کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا — فریداں کی فرمائش پُرانی ہو چکی تھی مگر اُس کا عزم ابھی تک جوان تھا۔ اُس دن وہ کام پر نہ گیا بلکہ سیدھا صرافوں کے بازار میں چلا گیا۔ اُس راستے سے وہ ہزاروں بار گزر چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں وہاں کے ایک ایک شوکیس سے مانوس تھیں۔ پرانے قلعہ کی طرف

جاتی ہوئی چھوٹی گلی کے نکڑ والے نلکے سے اُس نے سینکڑوں بار اوک سے پانی پیا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے ہو کر نہ جانے کتنی مرتبہ اُس نے شوکیسوں میں سجی ہوئی پونہچیوں کو نظروں میں سمیٹا تھا۔ نلکے اور بجلی کے کھمبے کے درمیان والی دُکان میں پونہچیوں کے اَن گنت جوڑے تھے، ہر نمونے، ہر وزن اور ہر مذاق کی پونہچیاں۔ خدا داد خاں نے اُسی دُکان سے چار تولے سونے کی دو پونہچیاں خریدیں۔ اُنھیں باریک سرخ کاغذ میں لپیٹ کر اپنی کالی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور پھر تانگے میں بیٹھ کر نور پور کی سمت چل پڑا۔

تانگے میں جُتا ہوا سفید گھوڑا مری روڈ پر قدم چال جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے پیڑوں کی قطاریں تھیں اور ان سے پرے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی پیلی پیلی ردائیں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چند دیہاتنیں گھڑے سر پر اُٹھائے ایک قطار میں چل رہی تھیں۔ اُن کے اُوپر، بہت اُوپر، آسمان کی بلندیوں میں کونجوں کی ایک ڈار اُڑتی ہوئی پہاڑوں کی سمت جا رہی تھی۔ پیڑوں کے نیچے بیٹھا ہوا نوجوان دیہاتی مخصوص غیر فانی لَے میں وارث شاہ کی ہیر گا رہا تھا اور پگڈنڈی پر چلتی ہوئی کونجوں کے ننگے پاؤں رُکے جا رہے تھے۔

"فریدآں ابھی تک جوان معلوم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اور سکینہ بہنیں جان پڑتی ہیں۔" یہ سوچتے ہوئے خدا داد خاں نے صافہ کھول کر پھر نئے سرے سے باندھا۔

"تیز چلو نا سنگی۔" اُس نے تانگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

پہلوانی ڈیل ڈول والے چھاچھی تانگہ بان نے مُڑ کر خداداد خاں کی طرف دیکھا۔ اور پھر باگ ڈھیلی کر دی۔

گھوڑا دُلکی چلنے لگا۔

"چابک لگاؤ ناسنگی" خداداد خاں نے بے تاب ہو کر کہا۔

تانگہ بان نے نشست سے اُٹھ کر چابک ہوا میں گھمایا۔ تڑاخ تڑاخ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گھوڑے کی دُم میں تناؤ پیدا ہوا اور پھر وہ کنوتیاں بدل کر سرپٹ بھاگ پڑا۔ ٹاپوں کی کٹ کٹ فضا میں گونجنے لگی۔ گھوڑے کے پاؤں میں جڑے ہوئے نعل تارکول کی سڑک کا سینہ کوٹ کوٹ کر چنگاریاں پیدا کرنے لگے۔ گھوڑے کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگھرو بج بج کر راہگیروں کو خبردار کرنے لگے۔

اوجڑیاں کے قریب پہنچ کر تانگے والے نے باگ کھینچ لی۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے ہوئے گھوڑے نے کچھ دیر دم لے کر چوبچہ سے پانی پیا اور پھر تازہ دم ہو کر سڑک پر دَوڑنے لگا۔ سڑک کے دائیں جانب ایک زیارت پڑتی تھی جس کے آنگن میں بیٹھے ہوئے مجاور نے تانگہ دیکھ کر نوبت بجائی۔ خداداد خاں نے چونّی ہوا میں اُچھال کر مجاور کی طرف پھینک دی۔

نور پور پہنچتے ہی خداداد خاں اُچک کر تانگے سے نیچے اُترا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے کی ریشم جیسی ایال پر ہاتھ پھیرا، اُس کی گردن تھپتھپائی۔ تین روپے تانگے والے کی ہتھیلی پر رکھ کر اپنی مونچھوں کو دو چار تاؤ دیئے۔ پکی سڑک کی آخری بلندی پر رُک کر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کائنات کے ذرّے ذرّے نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ ہر شے حسین نظر آنے لگی۔ سنبلو سے لدی ہوئی

پہاڑیاں مسکرا اُٹھیں۔ گول گول پتھروں سے ٹکراتا ہوا ندی کا صاف و شفاف پانی میٹھے میٹھے گیت گانے لگا۔ اُس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ڈھالو راستہ طے کیا۔ ندی کے اُس پار پہنچ کر وہ پگڈنڈی پر ہولیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ آج اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو بر آئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ جھٹ پونہچیاں واسکٹ کی جیب سے نکال کر فریداں کی کلائیوں میں پہنا دے گا۔ آج فریداں کی فرمائش پوری ہو جائے گی۔ یک بیک پونہچیاں دیکھ کر فریداں کا دل دھک دھک کرنے لگے گا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئیں گے۔ سارے نور پور میں یہ دوسرا پونہچیوں کا جوڑا ہوگا۔ پہلا نمبردار کے بیٹے کی دُلہن کا تھا اور اب فریداں کی کلائیوں میں ہوگا۔

"اباجی یہ سُرخ کاغذ میں کیا ہے؟" دفعتہً ایک آواز آئی۔

خداداد خاں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ سکینہ دو خالی گھڑے سر پر اُٹھائے ہوئے بیچ راستے میں کھڑی تھی۔

"اباجی یہ سُرخ کاغذ میں کیا ہے؟" قریب آکر سکینہ نے کالی واسکٹ کی جیب سے باہر نکلے ہوئے باریک سُرخ کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" خداداد خاں نے باریک سُرخ کاغذ کو جیب کے اندر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کچھ تو ہے اباجی۔" سکینہ نے گھڑے زمین پر رکھ دیئے۔

"اچھا تو پہلے تم پانی بھر لاؤ، پھر گھر آکر دیکھنا کہ اِس کاغذ میں کیا ہے۔"

خداداد خاں نے دایاں ہاتھ جیب پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اُوں ہونہہ" سکینہ نے دائیں بائیں سر جھٹک کر ضد کی۔

"دیکھو بیٹیا"

"نہیں ابّا جی، میں ابھی، یہیں دیکھوں گی کہ اس سرخ کاغذ میں کیا ہے" سکینہ نے بات کاٹ کر کہا اور پھر جھٹ ایک ہاتھ کالی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔

"سکینہ!" خداداد خاں یہ کہتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ابّا جی" سکینہ مچل گئی۔

"تم بڑی ضدّی ہو" باپ نے جیب پر رکھا ہوا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بابل" سکینہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور پھر گھڑے وہیں چھوڑ کر پونچھیاں ہاتھوں میں لیے گھر کی طرف بھاگ پڑی۔ گلے میں مقیش والی کالی چُنری ڈالے سکینہ پگڈنڈی پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ خداداد خاں کی محبت بھری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں حتیٰ کہ وہ ایک پہاڑی کے دامن کو چھُوتی ہوئی لوکاٹ اور شہتوت کے پیڑوں کے جھُنڈ میں غائب ہو گئی۔ خداداد خاں خالی گھڑے ہاتھوں میں لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ کہیں دُور کوئی چرواہا بانسری پر مرزا صاحباں کے بول الاپ رہا تھا۔ جنگلی کبوتر ہوا میں اُڑانیں بھر رہے تھے۔ آک کی خودرَو جھاڑیوں کے سائے مشرق کی طرف پھیل رہے تھے۔

جب خداداد خاں نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی سکینہ نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے۔ اُس کی بھری بھری کلائیوں کو

پونہچیوں نے نکھار دیا تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ پونہچیوں کے چمکتے ہوئے ننھے ننھے طلائی گنبدوں نے اُس کی کلائیوں میں اک نئی آب و تاب پیدا کر دی تھی۔ جیسے کسی برفانی چوٹی کے بلّوریں ماتھے پر یک بیک سورج چمک پڑے۔ سکینہ ایک معصومانہ شوخی کے ساتھ سر کو دائیں بائیں جھٹکتی ہوئی پلنگڑی پر یوں اُچھلنے لگی جیسے دُلکی چلتی ہوئی گھوڑی پر سوار ہو۔ اُس کے پہلو میں اُس کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کی ماتا بھری آنکھوں سے سچ مچ خوشی کے آنسو نکل رہے تھے۔

پتھیرا

اُس کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ بھٹوں کے مالک، راج مزدور، گاڑی بان، کھیپ بھرنے والے، سب کے سب اُسے پتھیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ اینٹیں پاتھتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اُس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی۔ اُس کا بدن چلچلاتی دھوپ میں تانبا بن گیا تھا۔ اور اُس کے تانبے کے مضبوط ہاتھ حیرت انگیز تیزی سے مٹی کو پانی میں سوند سکتے تھے۔ اُس کی اُنگلیاں کمال پھرتی سے گندھی ہوئی مٹی کو آہنی سانچے میں ڈال کر کچی اینٹوں کی تخلیق کر سکتی تھیں۔ مٹی اور پانی۔ ان دو عناصر کے مزاج کو وہ اُتنا ہی پہچانتا تھا جتنا کہ بیگم جان اُس کے پیار، غصے اور بھوک کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے تو وہ جیٹھ کی گرمی میں بھی ٹھیک وقت پر کھانا لے کر برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاتی تھی۔ سر پر ایندوا، اُس پر لسی کی ٹھلیا اور روٹیوں کی پوٹلی۔ اس انداز میں بیگم جان کا قد اور بھی لانبا معلوم ہوتا۔

آج بھی بیگم جان نے برگد کی گھنی چھاؤں میں پہنچ کر اُس میدان کی طرف

دیکھا جو زمین کی سطح سے نیچا تھا۔ جہاں پسینے میں شرابور مرد عورتوں کے جوڑے اپنے اپنے کام میں مُنہمک تھے۔ عورتیں گُندھی ہوئی مٹی کے نچے تُلے لوندے بنا رہی تھیں مرد آہنی سانچوں کو پلٹ پلٹ کر اینٹیں نکال رہے تھے۔ اگرچہ پیشے کی رُو سے اُن عورتوں کو پتھیرنیں اور مردوں کو پتھیرے کہنا مناسب تھا، تاہم اُن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نام تھا۔ صرف ایک چوڑے چکلے سینے والے نوجوان کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اُسے ہر شخص پتھیرا کہہ کر پکارتا تھا۔ آج بھی وہ نوجوان چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ چند ماہ پہلے جب بیگم جان اُس کے ساتھ کام کیا کرتی تھی تو دیکھنے والے دانتوں تلے اُنگلیاں دبا کر رہ جاتے تھے۔ جب پتھیرا اور بیگم جان مل کر کام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی، پانی، حرکت اور پسینے نے سارے میدان پر فتح پا لی ہو۔ بیگم جان تو اب بھی چاہتی تھی کہ پتھیرا اُسے کام پر آنے کی اجازت دے دے۔ لیکن یہ بات زبان پر لانے سے بیگم جان ڈرتی تھی۔ اس لیے کہ اُسے چند ماہ پہلے کی واردات بھولی نہیں تھی۔ اُس دن ایک نووارد نے اس پر آوازہ کسا تھا۔ اُس دن اگر ٹھیکیدار اور دوسرے لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو پتھیرا نووارد کی تکّا بوٹی کر دیتا۔ اُس واقعہ کے بعد دو چار روز تو بیگم جان خود ہی کام پر نہ آئی۔ بھٹے کے قریب اینٹیں جوڑ کر بنائی ہوئی کوٹھری میں پڑی رہی۔ لیکن جب اس کی اُنگلیوں میں کُھل ہونے لگی اور اُس نے کام پر جانے کی خواہش ظاہر کی تو پتھیرا اُسے اینٹوں کے میدان میں لانے کے بجائے قریب کے گاؤں میں لے گیا جہاں اُس نے بالا بالا ایک چھوٹا سا کچا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔

آج بھی پتھیرے کے جسم کا تانبا سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ بیگم جان کو

دیکھتے ہی چمکتا ہوا تانبا کام جہاں کا تہاں چھوڑ کر روٹی، لسّی اور بیگم جان کے پاس پہنچ گیا۔ اور برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اس نے روٹی اور لسّی کی طرف زیادہ اور بیگم جان کی طرف کم توجہ دی۔ شروع شروع میں بیگم جان کو پھیرے کا یہ رویّہ سانپ بن کر ڈستا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ سمجھ گئی کہ پھیرے کی بھوک پھیرے کے پیار سے زیادہ جاندار ہے۔ بیگم جان یہ بھی جانتی تھی کہ پھیرا کھانا کھا لینے کے بعد اس کی طرف محبّت بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہے لیکن آج پھیرے کی بھوک اور پیار میں نمایاں کمی تھی۔ جب ایسا ہوتا تھا تو بیگم جان سمجھ جاتی تھی کہ پھیرا اُداس ہے اور تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ جب پھیرا اُداس ہو تو اُس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ اسی لیے آج بیگم جان پھیرے کو کھانا کھلا کر چُپکے سے کھِسک گئی۔ اور پھیرا برگد کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر اُونگھنے لگا اور جب وہ اُونگھتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ وہ سوچتا ہے، اُن باتوں کے متعلّق جو اپنے پرائے کی زبان پر تھیں۔ دوسری شادی۔ کیونکہ پانچ سال سے اُوپر گزر چکے تھے مگر ابھی تک کوئی آس نہ بندھی تھی۔ بیگم جان نے لاکھوں جتن کیے۔ پیر فقیر، تعویذ گنڈے ٹونے ٹوٹکے، مزاروں پر منّتیں، دوا دارو، اُس نے سب کچھ کیا مگر اُمید بر نہ آئی۔ آخر کار میٹھی میٹھی لوریاں اپنے ذہن کے گوشوں میں دبا کر وہ پھیرے کی بھُوک، پیار اور غصّے کی تن من سے دیکھ بھال کرنے لگی۔

بعض اوقات بیگم جان کو یوں معلوم ہوتا جیسے اینٹیں پاتھتے پاتھتے پھیرے کا دل بھی اینٹ کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب کبھی اُس کے ذہن کے گوشوں میں دبی ہوئی میٹھی میٹھی لوریاں اُبھر کر سارنگی کے تاروں کی طرح سن سن کر اُٹھتیں اور

وہ اپنے خیالی ننھے مُنّے کی باتیں کرتے کرتے بے اختیار رو پڑتی تو پھیرا اُٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگتا، سُوتلی بٹنے میں محو ہو جاتا یا اچانک اُسے کوئی اور کام یاد آجاتا۔ بیگم جان بانجھ ہے۔ اس موضوع پر پھیرا اپنے رشتہ داروں کی باتیں سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ بڑی بوڑھیاں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر نسل کی سلامتی کی تلقین کرتیں مگر پھیرے کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔

کبھی کبھی گاؤں کی گلی سے گزرتے ہوئے جب پھیرا کسی بچّے کی طرف غور سے دیکھتا تو بچّہ اُس کی بڑی آنکھیں اور جُٹی بھویں دیکھ کر ڈر جاتا اور چیخیں مارتا ہوا گھر کو بھاگ جاتا۔ ایک دن پھیرا خود اپنی چیخ سُن کر سہم گیا۔ اور یہ وہ چیخ تھی جو دوسرا انسان نہیں سُن سکتا۔ یہاں تک کہ وہ کربناک گونج بیگم جان بھی نہ سُن سکی۔ حالانکہ وہ اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ بیگم جان پہلی مرتبہ پھیرے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ پھر یکایک اُسے مسرّت کا احساس ہوا، یہ سوچ کر کہ پھیرے کا دل اینٹ کی طرح سخت نہیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد بیگم جان سوچنے لگی کہ اینٹ کی طرح سخت دل تو کہیں بہتر تھا۔ کیونکہ پھیرے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی تھی۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ بیگم جان کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہے۔ پھیرا بان کے کھٹولے پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کے تانبے ایسے سینے پر ایک پڑوسی کا بچّہ بیٹھا، توتلی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔ پھیرے کی آنکھوں سے بہتی ہوئی ندی کا راز بیگم جان اچھی طرح جانتی تھی۔ اور ایک دن بیگم جان کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا دھارا پھوٹ نکلا۔ اور اُس دھارے کا سرچشمہ وہ خوشی تھی جو ایک عورت ہی جان سکتی ہے۔ اُس دن پھیرے نے محسوس کیا کہ

آسمان پر دھنک نکل آتی ہے۔ سُوکھی ٹہنیاں ہری ہوگئی ہیں۔ پکی اینٹیں چاندی کی طرح کھنکنے لگی ہیں۔ اور تمام کائنات نغمہ و ساز سے گونج اُٹھی ہے۔ اُس کا غصہ بھٹے کی آگ میں جل کر راکھ ہوگیا اور اُس کے پیار نے برگد کے پیڑ کے ڈالوں اور جٹاؤں سے زیادہ پھیل کر بیگم جان کو اپنی گھنی چھاؤں میں لے لیا۔ تاںبے ایسے جسم میں دونی طاقت آگئی۔ بیگم جان نے وزنی چیزیں اُٹھانا بند کر دیں۔ ذائقہ کھٹی چیزوں کی جستجو میں رہنے لگا۔

ایک دن بیگم جان نے دو چھوٹے چھوٹے کُرتے، نہالچے اور لنگوٹ سی کر اپنی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھ ڈالے۔ لمحات کے قافلے کھِل کھِل ہنستے بیت گئے۔ اور پھر ایک دن چمکیلی دھوپ میں، ایک عورت دوڑتی ہوئی اینٹوں کے میدان میں پہنچی۔ اُس نے پتھیرے کے کان میں کچھ کہا۔ پتھیرا فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ بھٹے کی چمنی سے بھی اُونچا ہوگیا ہو۔ جیسے اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں آہنی سانچے سے بھی زیادہ سخت ہوگئی ہوں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی سمت چل پڑا۔ اُس کے ہاتھ مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے ماتھے پر لرز رہی تھیں۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی پگڈنڈی پر اُس کے ننگے پاؤں کی دھمک سُن کر بٹیروں کی ڈار خوفزدہ ہوکر دوسری طرف نکل گئی۔ اُس کے دائیں بائیں گیہوں کی سنہری بالیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اُس کے پنجے اور ایڑیاں پگڈنڈی کے کناروں پر اُگی ہوئی ہری ہری دُوب پر سبلوں کی طرح دھائیں دھائیں برسنے لگیں۔ ہر رنگ، ہر شے، ہر منظر سے بے نیاز وہ اپنے وجود سے ہٹ کر چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا۔ نئی زندگی کی پہلی آواز سُن کر اُس کا

انگ انگ ناچ اُٹھا۔ اپنے نوزائیدہ بچے کو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ وہ چیخ پڑے، قہقہے مارے، پچاس روپے کے سکے جو اُس نے زمین میں دفن کر رکھے تھے، آج انھیں اندھیرے سے باہر نکال کر دائی کی جھولی میں ڈال دے۔ جذبات کے ہجوم میں اُس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اُس نے مسکرا کر بیگم جان کے خشک ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ عورتوں کے مبارکباد کے شور سے پھولا نہ سمایا۔ آج بیگم جان پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آنے لگی۔ رات گئے دئیے کی لَو میں وہ سوئی ہوئی بیگم جان اور اپنے بچے کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے زمین میں سے پچاس روپے کے سکے نکال کر بیگم جان کے میلے کچیلے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

دوسرے دن بھانڈ آئے تو منہ مانگا انعام پا کر نہال ہو گئے۔ بہشتی، نیم کے پتوں کا سہرا سر دل سے باندھ کر ہٹا تو پتھیرے نے دو روپے اُس کی مٹھی میں تھما دئیے۔ دائی کو چھینٹ کا جوڑا اور پانچ روپے دے کر رخصت کیا گیا۔ بڑی بوڑھیوں نے منہ میٹھا کیا اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔

چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ سُگھڑ عورتوں نے مشورہ دیا "منے کے ختنے کرا ڈالو۔ بچہ بڑا ہو جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔" بیگم جان نے پتھیرے سے ذکر کیا۔ اگلے دن پتھیرے نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ آن کی آن میں میدان کے چاروں کونوں میں خبر پھیل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ بار بار دہرائے جانے پر یہ بات بھی خود بخود طے پا گئی کہ پتھیرا ساری برادری کو میٹھے چاول کھلائے گا۔ پتھیرا شام کو گھر لوٹ کر آیا تو بیگم جان بھانپ گئی کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے۔ بات کھلی تو بیگم جان نے تن کر کہا۔ "میرے لاڈلے کے ختنے دھوم دھام سے ہوں گے۔ اگر

دُنیا میں ضرورت نہ ہوتی تو قرض اور سُود کا وجود نہ ہوتا۔ یہ سُن کر پتھیرے کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ دوسرے ہی دن وہ قرض مانگنے کے لیے ٹھیکیدار کے پاس جا پہنچا۔ ٹھیکیدار چارپائی پر بیٹھا ہوا پتھیروں کے جمعدار سے باتیں کر رہا تھا پتھیرے کو دیکھ کر ٹھیکیدار مسکرا کر بولا۔ "بڑی عمر ہے کہ آئے ہو۔ ابھی تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا"۔

پتھیرا زمین پر بیٹھ گیا۔

ٹھیکیدار بولا۔ "تمھیں سُن کر خوشی ہوگی کہ مجھے ایک بہت بڑا ٹھیکہ ملا ہے چند سرکاری عمارتیں ساٹھ دن کے اندر اندر تعمیر ہو جانی چاہئیں۔ مجھے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں سپلائی کرنی ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ لیکن یہ میری آبرو کا سوال ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے اتوار اس میدان میں اینٹیں بنانے کا مقابلہ ہو۔ جو شخص سب سے زیادہ اینٹیں بنائے گا اُسے اُجرت کے علاوہ دو سو روپے کی رقم بطور انعام دی جائے گی"۔

"اللہ سرکار کو سلامت رکھے"۔ پتھیرا بولا۔

ٹھیکیدار نے چلم کا گہرا کش لے کر دھواں ناک سے باہر نکالا۔ جمعدار نے صافے کا شملہ دُرست کر کے مونچھوں کو دو چار تاؤ دیئے۔

ٹھیکیدار بولا۔ "اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ میرے پاس اینٹوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے گا۔ اور پھر اس لالچ میں دوسرے بھٹوں کے کاریگر کم از کم ایک دن کے لیے میرا کام کریں گے۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ کاریگر لوٹ کر دوسرے بھٹوں پر نہ جائیں۔ اور یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس علاقے میں ایسا جوان پیدا ہی نہیں ہوا جو تم سے زیادہ اینٹیں بنا سکے۔ اس لیے سمجھ لو کہ اگلے اتوار دو سو روپے کی رقم

تمھارے پاس پہنچ گئی"۔

ٹھیکیدار کی گفتگو سُن کر پھیرے کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ گھر پہنچ کر اس نے سارا قصّہ بیگم جان کو سُنایا۔ بیگم جان کو بے حد مسرّت ہوئی۔ وہ بولی "جب خدا دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔" طے پایا کہ اگلے اتوار بیگم جان اُس کے ساتھ کام کرے گی۔ اگر پھیرا بجلی کی طرح کوندے بھرے گا تو وہ شعلہ بن کر میدان کے سینے پر لپک لپک جائے گی۔ دو سو روپے کی رقم حاصل کرنے کے لیے۔ تاکہ مُنّے کے ختنے دھوم دھام سے ہو سکیں۔

اتوار کے دن میدان کے چاروں طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آنے لگے۔ قرب وجوار کے دیہاتوں سے، بوڑھوں، جوانوں اور نوعمر لڑکوں کی ٹولیاں سورج نکلنے سے پہلے ہی تماشا دیکھنے آ پہنچیں۔ تماشائی دن کا کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ باجرہ، مکّا اور گیہوں کی روٹیاں، آم کا اچار، گُڑ کی ڈلیاں، پیاز کی گنٹھیاں۔ برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں درجنوں پانی سے بھرے کورے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر شخص ٹھیکیدار کی سخاوت اور حسنِ انتظام کی تعریف کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس میدان میں میلہ لگ گیا ہے۔

ڈھول کی پہلی آواز بلند ہو کر آس پاس کی وادیوں میں گونجی۔

میلوں ٹھیلوں کے شوقین جاٹ سینے پھیلا کر مست ہو گئے۔ میدان کے چاروں طرف انسانوں کی چوہری چوہری دیواریں کھنچ چکی تھیں۔ اس لیے نئے آنے والے تماشائیوں میں سے کچھ برگد کے پیڑ پر چڑھ کر ڈالوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ میدان

سے ذرا پرے ٹیلوں ٹبّوں اور اینٹوں کے چٹّے پر کھڑے ہو گئے۔

میدان کے بیچ نمبردار کا کلف دار شملہ دُور سے نظر آ رہا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ نمبردار کو ثالث مقرر کیا گیا ہے۔ اور نمبردار کے فیصلے سے پہلے ہر شخص فیصلہ کر چکا تھا کہ ٹھیکیدار بڑے دماغ کا مالک ہے، جس نے اُس علاقے میں ایک نئے میلے کی بنیاد رکھی ہے۔ کبڈّی، سمی، دنگل، کھلیانوں اور میلوں ٹھیلوں میں تو ہمیشہ ڈھول بجتے تھے مگر اینٹوں کے میدان میں کبھی ڈھول کی آواز نہ سُنی گئی تھی۔ وہاں تو صدیوں سے انسان کا پسینہ بہتا چلا آیا تھا۔ خدا جانے وہاں پتھیروں کے کتنے قبیلے مٹّی کھودتے کھودتے خود پیوندِ زمین ہو گئے تھے۔ آج اُس میدان میں مرد عورتوں کے جوڑے اپنے برسوں کے ریاض کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے گزشتہ شام مٹّی گوندھ کر رکھ چھوڑی تھی۔ آج صبح گندھی ہوئی مٹّی کو پانی کے چھینٹے دے کر تر کیا تھا۔ میدان میں ریت بچھی ہوئی تھی۔ مرد لوہے کے سانچے سامنے رکھے ڈھول کی دوسری آواز کے منتظر تھے۔ عورتیں مٹّی کا پہلا لوندا بنانے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ ڈھول کی دوسری آواز پر حرکت کا طوفان آنے والا تھا۔ اُس آواز سے پہلے خیالات کے قافلے، اپنی اپنی بساط کے مطابق، تمنّاؤں کے میناروں کا تیزی سے چکر کاٹ کر لوٹ آئے۔ منچلے تماشائی شرطیں بدنے لگے۔ کسی نے نسوار کی چٹکی لی۔ بانکے نوجوانوں نے سگرٹ سلگا لیے۔ بڈھے حقّے گڑگڑانے لگے۔ ثالث نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیئے۔ جمعدار نے صافے کا پیچ ابرو پر سے ہٹا کر ٹھیکیدار کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

مشرق میں پھیلی ہوئی سُرخی گاؤں کی کنواری بیٹی کی طرح شرما کر چھپ گئی۔

آفتاب کی سنہری شعاعیں پہاڑ کی اوٹ سے اُبھر کر میدان میں جھانکنے لگیں۔

ڈھول کی دوسری آواز بلند ہوئی۔

حرکت کا طوفان آگیا۔ لوہے کے سانچے بے تحاشا کھٹ کھٹ کرنے لگے۔ نسوانی ہاتھوں کے لوچ لچک اور پھُرتی نے میدان کے ذرّے ذرّے کو گرما دیا۔ پسینے کے تھرتھراتے ہوئے قطرے آوازیں دینے لگے۔ دھرتی کانپ اُٹھی۔ زندگی کے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ ڈھولکیے کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چوبیں ڈھول کے پُڑوں کو اندھا دُھند پیٹنے لگیں ـــ ڈھولکیا خود جوش میں آکر اپنا سر دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔

دھما دھم۔ دھما دھم۔

گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ تماشائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بیگم جان کے ہاتھوں کی پرچھائیاں کمال تیزی سے میدان کے تپتے ہوئے سینے پر گردش کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پھیرے کے جسم کا چمکتا ہوا تانبا نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی اور پرچھائیوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ سینوں کے اندر مچلتی ہوئی تمناؤں نے رگوں کو اُکسا کر انگلیوں میں برقی رو بین دوڑا دی تھیں۔

بلّے بلّے۔ گاؤں کے پہلوان نے ایک ٹانگ پر ناچ کر داد دی۔ کہیں دور سے آیا ہوا کاریگر، بیگم جان اور پھیرا کی جوڑی سے آگے نکل گیا تھا۔ نیا جوش، نیا ولولہ، نئی دلچسپی کی لہر میدان کے چاروں کونوں میں دوڑ گئی۔ بیگم جان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ خیالوں کا تاج محل ڈولنے لگا۔ ہاتھ اوچھے پڑنے لگے۔

پھیرا بدستور کام کرتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "گھبراؤ نہیں بیگو! تم تھک

جاؤ گی تو میں اکیلا نپٹ لوں گا۔ میرے سینے میں میرا دم میرا ایمان ہے۔ اور اگر ایمان مضبوط ہو تو انسان پہاڑوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔"

یہ سُن کر بیگم جان کے جُثّے میں قوت عود کر آئی۔ ہاتھ بجلیاں بن کر کوندے بھرنے لگے۔ دو سو روپے کے سکّوں کی جھنکار کانوں میں امرت رَس گھولنے لگی۔ اُدھر پانسا پلٹ گیا۔ ایک سیا فام کاریگر سب سے آگے نکل گیا تھا۔ پتھیرا تیسرے نمبر پر تھا۔ ڈھول کی شہ پا کر سیاہ فام کاریگر کا انگ انگ پھڑک اُٹھا۔ اُس کی صحت مند ساتھن کی آنکھیں ہمت اور ارادے کی لَو دینے لگیں۔ بلّے بلّے۔ جیو مائی کے لال۔ ایک کہرام مچ گیا۔ وہ شور، گرما گرمی گھنٹوں جاری رہی۔ پہلا ڈھولکیا تھک گیا تو دوسرے نے اُس کی جگہ لے لی۔ بیچ بیچ میں کاریگر پانی پی لیتے۔ کوئی کمر سیدھی کر لیتا۔ کوئی اُنگلیاں چٹخا لیتا۔ جنگ جاری تھی مگر کام کی رفتار سست پڑ گئی۔ آہستہ آہستہ ہاتھوں کی حرکت ڈھول کی آواز کا ساتھ دینے سے انکار کرنے لگی۔ ٹھیکیدار نے میدان کا جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ ایک مہینے کا کام ایک دن میں ہو گیا تھا۔ اور اب اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ہونے والی تھی۔ ایک ہی رفتار پر کام کرتے ہوئے پتھیرا سب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب وہ چار ہاتھوں کا کام دو ہاتھوں سے کر رہا تھا۔ اُس کے سینے میں اُس کا دم اُس کا ایمان تھا اور اُس کا مضبوط ایمان ایک عجیب وغریب وقار اپنے ساتھ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ بیگم جان تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ صرف سیاہ فام جوڑا پتھیرے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ باقی تمام کاریگروں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے پتھیرے کے ہاتھ بھی کام کرنے سے

انکار کر رہے ہوں، جیسے اس کی انگلیوں میں سیسہ بھر گیا ہو، جیسے وہ اندھیرے میں کوئی چیز ٹٹول رہا ہو۔ پھیرے کا مقابلہ کرنے والا آخری جوڑا دفعتاً رُک گیا۔ جیسے ان کے سامنے کوئی بلند پہاڑ آ گیا ہو۔ سیاہ فام اور اس کی ساتھن سست قدموں سے چلتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔

گاؤں کے پہلوان نے علی کا نعرہ بلند کیا۔ ڈھول کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

"پھیرا جیت گیا! پھیرا جیت گیا!" ہر طرف شور مچ گیا۔ لوگ میدان میں ناچنے لگے۔

ڈھولکیے کی شوخ، باغیانہ اور تیز و تند چوٹیں۔ ناچنے والوں کے بول۔ چیخ پکار مستی میں آئے ہوئے انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"ہم جیت گئے ہیں۔ اُٹھو اب گھر پہنچ کر آرام کرنا۔" بیگم جان نے پھیرے کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

پھیرا زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بیگم جان خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پھیرے کو اُٹھا رہی تھی۔

"جیو ماٹی کے لال!"

گاؤں کا حکیم ہجوم سے نکل کر آگے بڑھا۔ اُس نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر پھیرے کی آنکھیں دیکھیں، نبض ٹٹولی اور پھر سر ہلاتے ہوئے اپنی سفید چادر پھیرے پر ڈال دی۔

سناٹا چھا گیا۔

بیگم جان کو یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ اُس میں دھنسی جا رہی ہو۔ بیگم جان کی ایک چیخ سُنائی دی اور وہ پھیرے کے ٹھنڈے جسم سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

"پھیرا جیت گیا" اس آواز سے میدان گونج رہا تھا۔ اس گونج میں بیگم جان کی نحیف اور لرزتی ہوئی آواز سنائی دی — "نہیں، پھیرا ہار گیا۔ ٹھیکیدار جیت گیا ہے۔"

جب قوسِ قزح کی آنکھ کھلی

آرام منزل

رمنا۔ ڈھاکہ

پیاری چندراوتی۔ سلامِ شوق

میری فلسفی سہیلی تمہارے قلم سے ایسی تحریر؟ ایسی کایا پلٹ؟ تمہاری باتیں تو عموماً خشک اور پھیکی ہوا کرتی ہیں۔ تم مفروضوں سے نتائج اخذ کرنے کے عادی ہو۔ مگر اس مرتبہ تمہارا خط شاعرانہ تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے زندگی میں پہلی بار بیر بھوم کے سُرخ راستوں میں دل کشی پائی۔ تمہارے کانوں نے وہاں کے ذرّے ذرّے سے پھوٹتی ہوئی موسیقی سُنی۔ وہاں کے ماحول کی اس شعریت نے تمہارے دل پر بھی اثر کیا جس میں ٹیگور کی عظمت نے پرورش پائی تھی۔ اور پھر تمہارے دل کی یہ کیفیت تمہیں نانور لے گئی اور وہاں تم نے وہ تالاب دیکھا جس کے کنارے پر رامی دھوبن کپڑے دھویا کرتی تھی۔ اور پھر تم نے وہ جگہ دیکھی، جہاں بیٹھ کر چنڈی داس محبت کے گیت گایا کرتا تھا۔

تمھارے خط میں یہ پڑھ کر کہ "اب میں محسوس کرتی ہوں جیسے میرے بدن میں ایک آگ سی سُلگ رہی ہے۔" مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت ہمیشہ عورت ہے، خواہ وہ فلسفی ہو یا سائنسدان، مصنفہ ہو یا سیاست دان۔ در اصل یہ آگ ہر عورت کے دل میں ایک بار ضرور سُلگتی ہے، جو یا تو سدا بہار پھولوں اور رس بھرے گیتوں کا روپ اختیار کر لیتی ہے یا پھر اُس کے شعلے یوں بلند ہو جاتے ہیں کہ اُن کی تپش میں فریب خوردہ عورت عمر بھر جلتی رہتی ہے۔ محبّت کی آگ عورت کی زندگی میں دوسری بار کبھی نہیں سُلگ سکتی۔ پہلی ناکامی کے بعد عورت کی دوسری محبت، محبت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو عملی طور پر حالات سے ایک طرح کا سمجھوتہ کیا جاتا ہے، تاکہ زندگی کی عمارت اڑا اڑا کر گر نہ جائے۔ عورت یہ دوسرا قدم اُٹھانے پر اس لیے مجبور ہو جاتی ہے کہ اُسے ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مرد کی رفاقت کے بغیر باوقار زندگی بسر نہیں کر سکتی، خواہ وہ مرد ذہنی اور فکری نقطۂ نظر سے اس سے کتنا ہی کم تر کیوں نہ ہو۔

پیاری چندا۔ سچ کہتی ہوں کہ اب میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ تم سنگلاخ چٹانوں سے اُتر کر سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ گئی ہو۔ اب تمھاری سوئی ہوئی نسائیت جاگ اُٹھی ہے۔ اب تم کائنات کی نبضیں محسوس کر سکو گی۔ اب تمھارے دل میں یہ خواہش لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جائے گی، کہ جب تم شرما کر آنکھیں نیچی کر لو تو محبوب آنکھوں کی گرمی تمھارے رخساروں کو چھُوتی رہے اور جب شدّتِ احساس سے کوئی نہ بول سکے تو خاموشی زندگی کے وہ اَن جانے اسرار و رموز کھول ڈالے جن سے تمھاری منطق آج تک واقف نہ ہو سکی تھی۔ تمھیں یاد ہو گا کہ جب کبھی میں تم سے اس موضوع پر بات

کرتی تھی تو تم میرا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔ تم میرے شدید سے شدید جذبات کو قہقہوں میں ڈبو دیا کرتی تھیں۔ یہ کہہ کر "جاؤ بھی، میں اس افلاطونی محبت کی قایل نہیں۔"

عورت جانتی ہے، کہ محبت کا معاملہ یک طرفہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اُس کو تسکین ہو جاتی ہے کہ کسی مرد نے اُس سے محبت کی۔ مرد کی فطرت میں تنوع پسندی ہے۔ ایک نہایت مہذب، پڑھا لکھا مرد بڑے خلوص و احترام سے ایک عورت سے محبت تو کر سکتا ہے مگر اُس کے دل میں ایک آئیڈیل عورت کو اپنانے کی خواہش کبھی نہیں مر سکتی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ جب اُس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ "کر دی جاتی ہے" میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے وطن میں جس سے ہماری محبت ہوتی ہے عموماً اُس سے شادی نہیں ہوا کرتی۔ اور پھر جب مرد باپ بن جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی یہ خواہش خود بخود دب جاتی ہے۔ اور پیاری چندرا۔ میں تمھیں یہ بھی یقین دلا سکتی ہوں کہ مرد کی آئیڈیل عورت نہ ابھی تک پیدا ہوئی ہے نہ کبھی پیدا ہوگی۔ اس لیے کہ ایک نسوانی چہرہ دوسرے نسوانی چہرے سے مختلف ہوتا ہے اور مرد کی نگاہ ہر اُس عورت کو جسے اس نے پہلے نہ دیکھا ہو، دلچسپ پاتی ہے۔ تم دلیل پیش کرو گی، کہ ہم میں بھی تو کمزوریاں ہیں۔ مجھے اس بات سے اتفاق ہے۔ مگر یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ عورت صرف سوچ سکتی ہے، عملی طور پر آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ اس ضمن میں تم اپنی اور میری مثال پیش کرو گی۔ لیکن ہمارے ڈھنگ کی عورتوں کی تعداد اس ملک میں کتنی ہوگی۔ مشکل سے ایک فی صد اور اس ایک فی صد میں بھی ہمارا طبقہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے مردوں سے زندگی کے نازک ترین مسائل پر

بحث مباحثے کیے ہیں۔ ہمیں خاصے پڑھے لکھے مردوں سے تبادلۂ خیالات کے مواقع ملے ہیں۔ عظیم المرتبت ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ منطق، سیاسیات، تاریخ، اقتصادیات، عمرانیات اور ادب و فن کے علم برداروں کو قریب سے دیکھا اور سُنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اپنا پیشہ تعلیم و تدریس ہے۔ مگر چندراوتی، یقین جانو کہ ان عظیم ہستیوں کی محفل میں میرے اندر عورت ہمیشہ اونگھتی رہی اور صرف احترام کا جذبہ جاگتا رہا۔ تمھیں یاد ہوگا جب ہم دونوں کلکتہ یونی ورسٹی میں ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے تو ہم نے گھنٹوں پروفیسروں سے پیچیدہ مسائل پر گفتگو کی۔ لیکن اُن کی قربت میں، خاموش کمروں میں، چُپ چاپ لائبریری میں، رُکھے پھیکے اور گھُٹے گھُٹے ماحول میں، ہم میں عورت کہیں بہت دُور چھپی بیٹھی رہتی تھی اور چندرا تمھیں یاد ہوگا وہ مصور جس کا نام گوپال مکرجی تھا، جس کا ایک چھوٹا سا اسٹوڈیو ٹالی گنج میں تھا، اُس کے نقش کتنے تیکھے تھے۔ ہمیں کوئی طاقت کئی مرتبہ کھینچ کر اُس کے اسٹوڈیو میں لے گئی۔ لیکن جب بھی میں گوپال مکرجی سے ملتی تھی، ایک عجیب جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ مجھے اُس وقت محسوس ہوا کرتا تھا کہ میں ایک بزرگ ہوں اور گوپال مکرجی ایک بھولا بھالا بچہ، چُپ چاپ اور شرمیلا، جس کی حرکات و سکنات میں نسائیت کی جھلک تھی اُسے دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیروں یا چاکولیٹ آئس کریم کا پیکٹ لاکر اُس کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں "ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھالو میرے گوپال اور اس بُرش کو چھوڑ کر ذرا سستالو، کیونکہ تمھاری نرم و نازک اُنگلیاں اتنی محنت برداشت نہ کر سکیں گی"

وہ پروفیسر اجیت کمار ڈے تمھیں یاد ہوگا جو ہمیں ڈراما پڑھایا کرتا تھا جس کا

سن اُس وقت پینتیس چھتیس کا ہوگا۔ مگر سر کے بال پک گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک تھی، جب وہ ہمیں ڈراما پڑھاتا تھا، تو کلاس روم میں سکوت چھا جاتا تھا۔ لیکن جب وہ لیکچر ختم کرتا، تو ہمارے دلوں میں ترحم کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ پروفیسر ڈے کے چہرے پر ہر وقت اُداس سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ سب کہتے تھے، کہ وہ کتابوں کا کیڑا ہے۔ اور پھر ایک دن وہ کتابوں کے اوراق میں دب کر چپ چاپ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

دراصل علم و ادب کی دُنیا بڑی رُوکھی ہوتی ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے علم کا سمندر روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا کوئی اور چھور نہیں۔ شاید تم یہ سوچ رہی ہو کہ آخر میں تم سے کیا کہنا چاہتی ہوں تم خود فلسفے کی پروفیسر ہو اور میں خواہ مخواہ علم بگھار رہی ہوں۔ پیاری چندرا تم خوب جانتی ہو کہ جب انسان کے جذبات اور احساسات نقطۂ عروج پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے اُس سے اُس کے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنے خیالات کی اڑان بعینہٖ تحریر میں نہیں لا سکتا۔ اور یہی وہ مقام ہے جو ایک عام پڑھے لکھے انسان اور فن کار کو علیحدہ علیحدہ شاہراہوں پر ڈال دیتا ہے۔ ایک عظیم فن کار وہ ہے، جو اپنے بلند جذبات اور احساسات کی صحیح عکاسی کر سکتا ہے۔ کاش، میں تمھیں بتا سکتی کہ آج میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ تقسیم کے بعد تم بیر بھوم چلی گئیں، مجھے ڈھاکے آنا پڑا، اور اب انگریزی ادب پر لیکچر دیتے دیتے میں تھک گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس ہو اور

تمھارے گلے میں بانہیں ڈال کر چپکے سے تمھارے کان میں کہہ دوں کہ "ہاں اُن کا خط آتا ہے۔ اُنھوں نے اپنا نیا فوٹو بھی بھیجا ہے۔" مگر یہاں کس سے دل کی بات کہوں۔ چندرا۔ زندگی کی اس منزل پر نیا دوست بنانا ممکن نہیں۔ اور پھر زندگی اس تیزی سے بیت رہی ہے اور ساتھ ساتھ درسی کتابیں بھی اس سُرعت سے بدل رہی ہیں کہ دونوں کا ساتھ دیتے دیتے میرے سر کے سامنے کے بال پک گئے ہیں۔ میرے ہونٹوں کے کونوں پر لکیریں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔

آج اتوار ہے۔ کالج بند ہے۔ میں اپنے فلیٹ میں کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔ ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ رمنا کے خوب صورت علاقے میں زندگی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ میری خادمہ کافی کی پیالی میرے سامنے میز پر رکھ کر دبے پاؤں باورچی خانے میں واپس چلی گئی ہے۔ میرے پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے جس پر میکبتھ کی کتاب اوندھی پڑی ہوئی ہے۔ شیلفوں میں انگریزی کی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ دروازوں میں بنفشئی پردے لٹک رہے ہیں۔ تپائی پر اُن کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ اور اس فوٹو کے پاس گل دان میں کیوڑے کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ چندرا سچ بتانا، کیا میں تمھیں اپنے من کی بات بتا سکی ہوں؟ شاید اب تم ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نکال سکو۔ اس لیے کہ اب تم خود سنگلاخ چٹانوں سے اُتر کر سرسبز شاداب وادی میں پہنچ گئی ہو۔ اب تم خود وہ نغمے سُن رہی ہو جو میں نے نو برس پہلے کلکتے میں سُنے تھے۔ اور جب وہ گھڑی آئی تھی، تو میں علم و ادب کی خشک دُنیا سے نکل کر ایک اَن پڑھ عورت بن گئی تھی۔ میں نے اپنی شخصیت کو گل نواز کی شخصیت میں کھو دینے میں ہی اپنی عظمت سمجھی تھی، اپنی تکمیل جانی تھی۔ گل نواز کی مسکراہٹ

میں ایک ناقابلِ بیان دلکشی تھی۔ اُس کی باتوں میں ایک انوکھا سحر تھا۔ جب میں تمھیں یہ باتیں سُناتی تھی تو تم میرا مذاق اُڑایا کرتی تھیں۔ لیکن چندرا، اب میں تمھارا مذاق نہیں اڑاؤں گی بلکہ دعا کروں گی کہ خدا کرے تمھاری آرزوئیں بر آئیں، اور تم ہمیشہ ہمیشہ شادمان و کامران رہو۔ اور ذرا دیکھو تو گل نواز چوکھٹے میں سے کیسی محبّت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا۔ گل نواز میرے سر کے بالوں اور میری بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی تعریف کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا "رخسانہ تمھاری آنکھوں میں جادو ہے۔" وہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ انسان ہمیشہ سے غلام ہے۔ وہ نسل و رنگ کا غلام ہے، دولت کا غلام ہے، رسم و رواج کا غلام ہے، اور نہ جانے کس کس کا غلام ہے۔ انسان کب آزاد ہوگا؟ کون جانے! کون جانے!!

چندرا۔ تمھیں میری اور گل نواز کی پہلی ملاقات یاد ہوگی۔ صرف ایک لمحے میں، صرف ایک آن میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ جیسے میں برسوں سے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات موہن بگان کے میدان میں ہوئی تھی۔ وہ پشاور سے فٹ بال ٹیم کے ساتھ آیا تھا۔ میچ کے دوسرے دن تمام اخباروں میں اس کے فوٹو چھپ گئے تھے۔ وہ اُس سیزن کا ہیرو تھا۔ اور اُس ہیرو نے میرے دل میں آگ سُلگائی اور پھر میری زندگی کے لمحات کو اپنی دل کش مسکراہٹوں سے رنگین بنا دیا۔ پھر وہ اپنی ٹیم کے ساتھ پشاور واپس چلا گیا۔ اور حسب وعدہ دو ماہ بعد پھر کلکتے آگیا۔ وہ دو مہینے میں نے کیسے کاٹے تھے۔ اس کا تمھیں اچھی طرح علم ہے۔ جب گل نواز میری آنکھوں کی تعریفیں کیا کرتا تھا تو خود اُس کی بڑی بڑی آنکھیں چمکنے لگتی

تھیں۔ اور پھر ایک ایسا دور آیا کہ دفعتہً لمحات عجیب سرعت سے دوڑنے لگے۔ تم بیربھوم چلی گئیں، گل نواز پشاور چلا گیا، اور میں مشرقی بنگال پہنچ گئی۔ آج اس سہانے موسم میں مجھے عہدِ رفتہ کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آ رہی ہیں۔ گل نواز آٹھ برس سے لکھ رہا ہے کہ "ڈھاکہ آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" مگر یہاں آنے کا وعدہ نہیں کیا۔ اُس کے خطوط مختصر سے مختصر تر ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ہر خط میں میری آنکھوں کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ اُس کا نیا فوٹو کل ہی پہنچا ہے۔ اُس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ وہی بھرے بھرے گال، قلمیں چھٹی ہوئی، گھنگھریالے بال اور ہونٹوں پر وہی دلکش مسکراہٹ۔

چندرا۔ اکثر دل میں خیال آتا ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کر لوں۔ میں نے پچھلے خط میں پروفیسر شکور کے متعلق لکھا تھا۔ وہ ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ ہر اتوار کو ٹھیک ساڑھے چار بجے میرے ہاں آتے ہیں اور ٹھیک پانچ بجے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس آدھ گھنٹے میں وہ بالکل میکانکی طور پر پہلے موسم کا ذکر کرتے ہیں، پھر میری صحت کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ اُس کے بعد یونی ورسٹی کے بارے میں دو چار باتیں کرکے کتابی زبان میں بالواسطہ اپنی اور میری تنہائی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر کافی کی پیالی پی کر خدا حافظ کہتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ اب چندرا تمہی بتاؤ کہ انسان اس دنیا میں کیسے جیئے؟ توبہ توبہ میں کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں تمہیں بھلا اِن باتوں سے کیا واسطہ؟ اس وقت تم اگر میرے قریب ہوتیں تو تمہارے گالوں پر ایک ہلکا سا چپت لگا کر پوچھتی کہ شانتی نکیتن پھر کب جاؤ گی؟

تمہاری رخسانہ

آرام منزل

رمنا۔ ڈھاکہ

پیاری چندرا

تم نے لکھا ہے کہ "اس مرتبہ تمھارے طویل خط کا طویل جواب دیا ہے۔" میں کہتی ہوں کہ تمھارا خط بہت مختصر ہے۔ دلچسپ تحریر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو ہمیشہ مختصر معلوم ہوتی ہے۔ تمھارا خط پڑھ کر میں گھنٹوں سوچتی رہی۔ تم پر جو آج بیت رہی ہے مجھ پر برسوں سے بیت رہی ہے۔ تمھیں شانتی نکیتن کی رومان پرور فضاؤں میں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ لیکن چندرا یہ بے چینی ہی تو زندگی ہے۔ اس جستجو، اس انتظار، اس بے کلی ہی سے تو زندگی کی آب و تاب قائم ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ وہ شاعر ہے اور اس کے مُوڈ کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور تمھارے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا ہے کہ وہ قنوطی ہے یا رجائی۔ چندرا تم خوش قسمت ہو کہ ایک شاعر تم سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے کہ ایک سچّے شاعر کی محبت جھُوٹی نہیں ہو سکتی۔ وہ عام لوگوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ تم اُس کے نغموں میں حیاتِ دوام حاصل کرو گی۔ لیکن ایک بات چپکے سے کہہ دوں۔ بجائے اس کے کہ وہ تمھارے ناز اُٹھائے، تمھیں اُس کے ناز اُٹھانے پڑیں گے۔ تم بھی اس کے ساتھ آسمانوں میں پرواز کرتی رہو گی۔ اور جب زمین پر قدم رکھو گی تو دیکھو گی کہ گھر بار نہیں، صوفے اور قالین نہیں، ریڈیوگرام اور ریفریجریٹر نہیں، اس لیے کہ شاعر پریکٹیکل نہیں ہوتا۔ اُس کی جیب روپے سے خالی ہوتی ہے، اور تخیّل کی مملکت انمول موتیوں سے مالا مال۔ دل پر چوٹ تو نہیں لگی؟ تم تو بڑی بے دردی سے میری باتوں کا مضحکہ اُڑایا کرتی تھیں۔

تم نے پوچھا ہے، کہ پروفیسر شکور کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔ یہ سوال اس وقت مجھے بڑا کرخت اور گھناؤنا معلوم ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ میں گل نواز کے فوٹو کے سامنے بیٹھ کر تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ اور پھر آج تو سوموار ہے۔ پروفیسر شکور کے متعلق تو صرف اتوار کو سوچا جا سکتا ہے۔

اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں۔ یہ میں تمھیں گھڑی دیکھے بغیر بتا رہی ہوں میرے ساتھ والے فلیٹ میں ابھی ابھی لائٹ آف کر دی گئی ہے۔ میرے پڑوسی فارسی کے پروفیسر ہیں۔ وہ ٹھیک بارہ بجے لائٹ آف کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد حافظ کے اشعار گنگناتے ہوئے سو جاتے ہیں، اور پھر صبح پانچ بجے اُن کے کمرے سے الارم بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس وقت رمنا کے علاقے میں سکوت چھایا ہوا ہے اور مجھے کالج کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جب چاروں طرف رومان پھیلا ہوا تھا۔ زندگی میں سوچ کم اور حرکت زیادہ تھی۔ اُس وقت ہمارا مطمحِ نظر ایک خوب صورت بنگلہ، موٹر کار اور ایک پڑھا لکھا، وجیہہ، خوش پوش اور باغ و بہار قسم کا شوہر تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری خوش فہمی کے بھرم کُھلتے گئے۔ اور پھر یونیورسٹی سے نکل کر ہم پر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ زندگی کی ٹھوس حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ بھی آشکارا ہو گیا کہ ہر طرف سے مردوں کی بے تاب نگاہیں ہمیں کیوں اتنی دلچسپی سے تکتی ہیں۔ اور پھر ایک دن موہن بگھان کے میدان میں میری آرزوؤں کی کلیاں کِھل اُٹھیں۔ مجھے ہر شے خوبصورت نظر آنے لگی۔ وقت کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ اور میں رنگین لمحات کے دھارے پر بہتے بہتے بہت دور نکل گئی۔ جہاں پہنچ کر ایک نئی دنیا ملتی ہے۔ جہاں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی، مہربان چاندنی بھی ہے اور ظالم دھوپ بھی۔ اس کے بعد اگر کچھ

لکھوں گی تو تمھارا جی اُکتا جائے گا، کیونکہ یہ باتیں تم ہزار بار سُن چکی ہو لیکن چندرا، یہ گزرے ہوئے لمحات، بیتے ہوئے دن اور اُن سے وابستہ یادیں، میری زندگی کا اہم جزو بن چکی ہیں۔ انھیں کے سہارے میں جی رہی ہوں۔ اور زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ کتابیں پڑھتے رہو۔ لیکچر دیتے رہو۔ رات ہو جائے تو سو جاؤ۔ صبح سویرے اُٹھ بیٹھو۔ موٹاپے سے بچنے کے لیے اسکپنگ کرو۔ غسل کرو۔ میک اپ کرو۔ اُجلا لباس پہنو۔ کلاس روم میں سنجیدگی اختیار کرو۔ سٹاف رُوم میں دوسری پروفیسروں سے مسکرا کر بات کرو۔ آخر انسان تھک ہی تو جاتا ہے۔ اُداس تنہائیوں کے لمحات روز بروز خوفناک ہوتے جا رہے ہیں۔ جوں جوں عمر بیت رہی ہے، موت کا خیال قریب آ رہا ہے، کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں، اور میں تمھاری گود میں اپنا سر رکھ کر آرام سے سو جاتی۔ آٹھ سال گزر گئے۔ طویل، رینگتے ہوئے، بے کیف سال۔ وہ کب آئے گا؟ میں عمر بھر اس کا انتظار کروں گی۔ تم کہتی ہو کہ "بُزدل ہو۔ خود پشاور کیوں نہیں چلی جاتیں؟" ہاں میں بُزدل ہوں، میں اجنبی شہر میں جانے سے گھبراتی ہوں۔ چندرا، اب میں ڈرتی ہوں کہ کہیں موت چُپکے سے میرا گلا نہ گھونٹ دے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تعطیلات ہونے والی ہیں۔ میں پشاور جا رہی ہوں۔ بُزدل ایسے ہی فیصلے کیا کرتے ہیں۔

تمھاری

رخسانہ

سرکٹ ہاؤس

کاکس بازار

میری چندرا

تمہارا محبت نامہ ملا۔ میرے فیصلے پر تم نے مبارک باد بھیجی ہے۔ شکریہ۔ لیکن اب تمہاری رائے مستحکم ہو جائے گی کہ میں اوّل درجے کی بزدل ہوں۔ اس لیے کہ میں نے پشاور جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ہوائی جہاز سے صوبہ سرحد جانے کی بجائے میں کاکس بازار چلی آئی ہوں۔ مس شکیلہ کی معیت میں وقت کٹ رہا ہے۔ مس شکیلہ اقتصادیات کی پروفیسر ہیں۔ یہاں آ کر اُن سے بے تکلفی ہو گئی ہے۔ ہم خلیج بنگال کے کنارے نہایت عالیشان سرکٹ ہاؤس میں رہتے ہیں شکیلہ گو ہماری طرح مس ہیں مگر اُن کے سر کے تمام بال پک گئے ہیں۔ بڑھاپا اپنی تمام آزردگی کے ساتھ اُن پر نازل ہو چکا ہے۔ مگر ابھی تک وہ اپنے عہدِ رفتہ کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ چندرا۔ تمہیں بتاؤ آخر اس دنیا میں سکونِ قلب کسے میسّر ہے؟ اس کا جواب میرے پاس ہے۔ سکونِ قلب میسّر ہے ہماری گوالن کو جو ہر روز صبح سویرے ہمیں دودھ دینے آتی ہے۔ اگر تم اُس کی صحت دیکھو، تو دنگ رہ جاؤ۔ وہ بڑی ہنس مکھ ہے۔ ہر روز ہمیں اپنی گھریلو زندگی کی ایک آدھ جھلک دے جاتی ہے۔ اس کا شوہر ہل چلاتا ہے۔ وہ دودھ بیچتی ہے، تن تنہا تین بچوں اور ایک گائے کی دیکھ بھال کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے، رات کو خاوند کے پاؤں دباتی ہے اور پھر اپنے بچوں اور خاوند کے ساتھ چٹائی پر سو جاتی ہے۔ اُسے اور اُس کے بچوں کو پیٹ بھر کر بھات مل جاتا ہے اور تن ڈھانپنے کو

کپڑا۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی دُنیا سے باہر نکل کر نہ دیکھنا چاہتی ہے نہ سننا۔ ایک دن میں نے یوں ہی اُس سے کہا۔ " دیکھو آج کل فلاں ملک کا بادشاہ ڈھاکے میں آیا ہوا ہے۔" یہ سُن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر اپنی سڈول اور چمکیلی پنڈلی کو کھجاتے ہوئے بولی۔" میم صاحب ہم تو صرف ایک بادشاہ کو جانتے ہیں۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔ میرا بادشاہ ابھی ابھی بیلوں کو ہانکتا ہُوا کھیتوں کی طرف نکل گیا ہے۔" چندرا، یہ دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ انسان کی مسرت اُس کی وسعتِ ادراک پر مبنی ہے۔ اب تمھیں بتاؤ کہ اگر تم رومان کی منزلوں سے گزر کر اپنے شاعر سے بیاہ کر لو تو کیا تم ہر شب اُس کے پاؤں دبانا پسند کرو گی؟ سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک ہم شادی کے بندھن سے ڈرتے رہے ہیں اس لیے کہ ہم جانتے ہیں شادی کے بعد عورت کا درجہ کیا ہوتا ہے۔ مرد اور عورت کی مساوات کاغذ قلم تک محدود ہے۔ اسے عمل میں کبھی نہیں لایا گیا۔ الٹرا ماڈرن عورتوں کی گھریلو زندگی تم سے پوشیدہ نہیں۔ جب کوئی انھیں کلب میں بنا سنورا دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت خوش ہیں۔ مگر اس چمک دمک کے پس پردہ کتنا خوفناک اندھیرا ہے۔ بات میں بات نکل آتی ہے۔ شاید تم اس بے ربط تحریر سے اُکتا گئی ہو۔

یہ تو میں یوں ہی دل کا غبار نکال رہی تھی، ورنہ سچ پوچھو، تو میں ہر شب گل نواز کے پاؤں دبانے کے لیے تیار ہوں۔ اسی طرح ہر عورت کا ایک گل نواز ہوتا ہے۔ اور پھر رات کی تنہائی، آس پاس کی کھُسر پھُسر اور گھُور گھُور کر تکنے والی نگاہوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ ہے کسی مرد کی پناہ۔

اچھا ہوا تم سنتھال پرگنا کا چکر لگا آئیں۔ سیاہ فام، گٹھیلے بدن والی سنتھالی عورتوں کا سیدھا سادا مگر پُراثر ناچ تمھیں بہت پسند آیا۔ کاش! میں بھی دیکھ سکتی۔ تم نے کینیڈین مشنری کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ لوگ بڑے دل گردے کے ہوتے ہیں۔ دیکھو تو اس جنگلی قوم کو سنوارنے کے لیے فادر میکالے نے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔

اچھا تو فادر میکالے نے تمھیں وائلن بجاکر سنائی اور وائلن بجاتے بجاتے اس کی نیلی نیلی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اری پگلی کہیں تمھارے حُسنِ تابناک نے اس کی رہبانیت کے قدم تو نہیں ڈگمگا دیئے؟ فادر میکالے آخر انسان ہی تو ہے۔ سنتھال پرگنا سے واپس آتے ہوئے تم چند دنوں کے لیے دبراج پور ٹھہرو گی۔ وہاں کے متعلق تفصیل سے لکھنا۔ اس خط کا جواب ڈھاکے کے پتہ پر دینا کیونکہ میں یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔ یہ ایک نہایت حسین مقام ہے۔ حدِّ نظر تک سمندر کا نیلا نیلا پانی ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے سامنے ریت کا وسیع و بسیط فرش بچھا ہوا ہے۔ مغرب میں سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا ہے۔ اس خوب صورت مقام پر کوئی مس شکیلہ کی سنگت میں کب تک جی سکتا ہے۔ کاش تم یہاں ہوتیں۔ کاش گل نواز یہاں ہوتا۔ بغیر دوست کے دُنیا کا حسین سے حسین مقام بھی اُداس، بے کیف اور بے معنی ہے۔ وہ دیکھو سمندر کے سینے پر دودھیا لہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ اِس وقت ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ مس شکیلہ بے خبر سو رہی ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا ہے۔ اُن کی جھرّیوں پڑی کلائی پر قیمتی رسٹ واچ بندھی ہوئی ہے۔ اِس وقت انھوں نے عینک نہیں لگا رکھی ہے۔ اور اُن کی اَدھ کھلی آنکھیں بڑی بھیانک معلوم ہو رہی ہیں۔ ابھی وہ اُٹھیں گی اور پُرانی باتیں دُہرائیں گی۔

ایک ہی ہفتے میں ان کی باتیں پُرانی ہو گئیں۔ دیکھا تم نے؟

تمہارا شاعر کلکتے سے کب واپس آرہا ہے۔ تم اُس کا انتظار کر رہی ہو۔ میری فلسفی سہیلی، فلسفۂ انتظار پر کوئی کتاب ہی لکھ ڈالو۔

تمہاری رخسانہ

لاہور

پیاری چندرا

خط کی پیشانی پر لکھا ہوا پتہ پڑھ کر شاید تمہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آئے۔ لیکن میں سچ مچ لاہور پہنچ گئی ہوں یہ کیسے ہوا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔ کاکس بازار سے ڈھاکے پہنچ کر میری حالت عجیب ہو گئی۔ کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ کتابوں سے جی بیزار ہو گیا۔ ایک دن میں بغیر سوچے سمجھے پی آئی اے کے دفتر میں چلی گئی اور لاہور کے لیے سیٹ بُک کرا آئی۔ اور آج میں لاہور کے ایک شاندار ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں۔ سڑک پر تانگے دوڑ رہے ہیں اور مجھے راج شاہی کا یکہ یاد آرہا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کا لباس ہم سے بہت مختلف ہے۔ شہر اچھا ہے مگر وہ بنگال کی ہریالی کہاں؟ آج صبح میں نے جہانگیر کا مقبرہ اور نور جہاں کی قبر دیکھی۔ اس لیے میرا جی بہت اُداس ہے۔ خیالات کہاں سے کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ دن بھر میں نور جہاں کے متعلق سوچتی رہی۔ اب شام ہو چکی ہے۔ برقی قمقمے روشن ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں انار کلی بازار میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی۔ واپس آکر کھانا کھا کر سو جاؤں گی۔

کل صبح کی گاڑی سے مجھے پشاور جانا ہے۔ گل نواز کو تار دے دیا ہے۔ خط مختصر ہے۔ اس سے تم میرے دل کی کیفیت کا اندازہ کر سکتی ہو۔ لیکن اس سے یہ قیاس نہ کرنا کہ میں اس اجنبی شہر میں گھبرا گئی ہوں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ میں تو ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے برسوں سے اسی شہر میں رہتی ہوں۔ ہاں مرد یہاں بھی گھور گھور کر عورتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا سارے ملک میں عام ہے۔ شاید ساری دنیا میں ہو۔ لیکن اگر لمحہ بھر کے لیے ہم سوچیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مردوں کا متجسس نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، ورنہ ہمارے میک اَپ کے کیا معنی ہیں؟ راہ چلتوں کی نگاہیں اگر ہمارے لپ اسٹک، روج اور پاؤڈر سے آراستہ چہروں کی خاموش داد نہ دیں تو یہ سراسر ہماری توہین ہے۔

آج کل یہاں بہار کا موسم ہے۔ پنجاب کے موسمِ بہار میں انسان کے بدن میں گدگدیاں ہونے لگتی ہیں۔ ہمارا سرسبز و شاداب بنگال موسمِ بہار سے واقف نہیں۔ وہاں تو ساون ہوتا ہے۔ جس میں بس سونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن یہاں کے موسمِ بہار نے مجھ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ تم یہ پڑھ کر ہنسو گی کہ آج میں اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے کوئی پندرہ بیس منٹ تک ناچتی رہی۔ وہی بھولا بسرا کتھا کلی ناچ یک بیک میرے انگ انگ سے پھوٹ پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے سر کے سامنے کے بال پھر سے سیاہ ہو رہے ہیں اور میرے ہونٹوں کے کونوں کی لکیریں مٹتی جا رہی ہیں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ سڑک پر پنجوں کے بل چلوں۔ میں نے ساڑھی اُسی اسٹائل سے پہننی شروع کر دی ہے۔ یاد ہے نا تم کو؟ ہم کالج کے زمانے میں مرشد آباد کی ساڑھی کس طرح پہنا کرتے تھے؟ پلّو سر پہ ڈالنے کے بجائے

کمر کے اِردگرد کس کر۔ اب میں پندرہ برس پیچھے چلی گئی ہوں۔ دراصل یہ جوانی اور بڑھاپا داخلیت کی پیداوار ہیں۔ اب تو موت جیسے میرے پروگرام میں شامل ہی نہیں۔ اب میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ ٹالی گنج والا گوپال مکرجی یہاں ہوتا تو میں اُس سے ضرور کہتی کہ تم پنجاب کے موسمِ بہار کو رنگوں میں قید کر لو۔ اس چابک دستی سے کہ کینوس کے سینے سے زندگی کے سوتے پھوٹ پڑیں، پژمردہ کلیوں میں جان آتی نظر آئے اور کملائے ہوئے پھولوں کی پتّیوں میں حیاتِ نَو کی لرزش دکھائی دے۔ یہ لو ہوا ئے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ تانگہ آگیا ہوگا۔ مجھے انارکلی بازار جانا ہے۔ خدا حافظ۔

تمھاری رخسانہ

پشاور

پیاری چندرا

میں آج صبح پشاور پہنچی اور کل رات کی گاڑی سے واپس لاہور جا رہی ہوں اور پھر وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکے چلی جاؤں گی۔ یہاں پہنچ کر سوچ رہی ہوں کہ میں تو اپنی منزل بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔

میں جانتی ہوں تم گل نواز کے متعلق کچھ سننے کے لیے بے تاب ہو رہی ہو۔ تو سنو میری چندرا۔ گل نواز مجھے اسٹیشن پر لینے آیا۔ اُس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں وہی چمک تھی۔ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر گھر لایا۔ اُس کے دل میں میرے لیے بے پناہ محبت ہے۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے اور

اس یقین کے سہارے میں زندگی کے باقی دن ہنسی خوشی کاٹ سکتی ہوں۔ وہ اب بھی سرزمینِ بنگال کی سحر آفرینیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اب بھی میری آنکھوں کی تعریف کرتا ہے۔ وہ اب بھی گفتگو میں نئی نئی تشبیہیں تراش لیتا ہے۔ مگر اب اُس کی تشبیہوں میں پختگی آ گئی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر میں حیران ہوتی ہوں کہ وہ بینک کا منیجر ہونے کے بجائے شاعر کیوں نہیں۔ شاید اسے فن کار بننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دراصل انسان کے جوہر کھلنے کا انحصار ساز گار مواقع میسّر آنے پر ہے۔ اس سے میری مُراد یہ ہے کہ شاید حالات نے اُسے اجازت نہیں دی کہ وہ خوب پڑھ لکھ سکے۔ اچھی طرح محنت کر سکے، جیسا کہ تم کہا کرتی ہو، جینیس (Genius) پیدا نہیں ہوتے بلکہ محنت سے بنتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو ایسی جگہوں پر کام کرتے ہوں، جن کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے۔

مجھے اس وقت مسٹر اصغر کا خیال آ گیا ہے، وہ ڈھاکے میں لوہے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ پگ آئرن، ٹول سٹیل اور مائیلڈ سٹیل کی باتیں کرتے کرتے وہ اکثر رو دیا کرتے ہیں۔ جانتی ہو وہ لکھ پتی ہیں مگر پھر بھی سکونِ قلب میسّر نہیں۔ اُن کے ہاں دن رات برطانیہ اور امریکہ سے کیبل گرام آتے رہتے ہیں۔ پرسوں لوہے کا بھاؤ گر گیا تھا آج چڑھ گیا ہے۔ اس دھندے سے انھیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور یہ وہ شخص ہے جو فن کار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چند سال پہلے ادبی حلقوں نے اُس کی صلاحیتوں کا سکہ مان لیا تھا۔ اب اس میں وہ فن کار مر چکا ہے جس کی لاش چاندی اور سونے کے انبار کے نیچے گل سڑ رہی ہے۔ میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں۔ چندرا اب تو میں اپنی تحریر کا ربط قائم نہیں رکھ سکتی۔ شاید اس لیے

کہ خیالات کے قافلوں نے اپنی رفتار تیز کر دی ہے اور میں ڈھاکے کے ساون سے بہت دور صوبۂ سرحد کے موسمِ بہار میں سانس لے رہی ہوں۔ اور گل نواز کے سادہ مگر خوب صورت دیوان خانے میں بیٹھی تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔

گل نواز نے دو دن کی چھٹی لے لی ہے۔ اب وہ ڈائننگ روم میں کھانا چُنوا رہا ہے۔ اُس کی اہلیہ نے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانا پکایا ہے۔ چندرا، اگر تم گل نواز کی اہلیہ کو دیکھ لو، تو شاید اپنا سارا فلسفہ بھول جاؤ۔ عورت کی فطرت تم سے پوشیدہ نہیں۔ ایک عورت دوسری عورت کی خوبصورتی کی تعریف کرنا گوارا نہیں کر سکتی اور خصوصاً اپنے محبوب کی اہلیہ کی۔ گل نواز کی اہلیہ کے حُسن کو اب میں کس سے تشبیہہ دوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اگر گوپال عمر بھی تمام عمر آرزو کی صرف گھنی پلکوں کے سائے رنگوں میں اُتارنے کی کوشش کرتا رہے تو شاید اُس کا ہزارواں حصہ پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہاں تو گل نواز کی اہلیہ کا نام آرزو ہے۔ وہ بڑی شرمیلی ہے اور اس کے شرمیلے پن میں ایک ناقابلِ بیان جمالیاتی پہلو کی جھلک ملتی ہے۔ اُن کا ایک بچہ ہے، بڑا پیارا اور خوبصورت اُس کی شکل و صورت سو فی صد گل نواز سے ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے بچے کا نام شاہ نواز رکھا ہے۔

اس وقت اس گھر میں پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ برآمدے کی چھت میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ دیوان خانے میں سونے کے کمرے میں، آنگن میں، چڑیاں بے خوف و خطر پھدک رہی ہیں۔ پیلی پیلی چونچوں والی دو گٹاریں آنکھیں بند کیے اطمینان سے کھڑکی میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ابھی شاہ نواز کے رونے کی آواز

آئی تھی اور آرزو نے باورچی خانے سے نکل کر اُسے گود میں لے لیا ہے۔ اب وہ آنگن میں پیڑھی پر بیٹھ گئی ہے۔ اب اُس نے اپنی دودھ بھری چھاتی ننھے کے منہ میں دے دی ہے اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر شرما رہی ہے۔ آنگن سے موتیا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ اب تمھیں بتاؤ کہ اس گھر میں، اس پُرسکون گھر میں، معصومیت اور زندگی سے بھرپور گھر میں، اگر ایک ہلکی سی لرزش بھی آجائے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ تو میری چندرا، کل رات کو میں یہاں سے چل پڑوں گی اور ڈھاکے پہنچ کر اتوار کا انتظار کروں گی۔ اور جب وہ دن آجائے گا تو ساڑھے چار بجے اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گی۔

تمھاری

رخسانہ

مولا پہلوان

ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی۔ مولا پہلوان گاؤں کے اکھاڑے کے پاس دو اینٹوں پر ہاتھ جمائے ڈنڈ پیل رہا تھا۔ اس سے کوئی چار قدم پرے وزیرا سرسوں کے تیل سے اپنی رانوں اور پنڈلیوں کی مالش کر رہا تھا اور نظیرا تابڑ توڑ بیٹھک لگا رہا تھا۔ مولا پہلوان کے منہ سے پے در پے نکلتی ہوئی "اوں ہونہہ، اوں ہونہہ" کی آواز خاموشی کو چیرتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گوالوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہ عمیق — جان دار اور بھرپور آواز اُن گوالوں کے لیے اجنبی نہ تھی۔ یہ آواز تو وہ ہر روز سنتے تھے۔ رات کے آخری دھندلکے میں جب وہ دودھ کی گاگریں سر پر اُٹھائے شہر کی طرف جاتے تو اُسی آواز کے سہارے وہ پیڑوں کے آسیب زدہ جھنڈ سے گزر کر ندی کے اُس پار پہنچ جاتے۔

مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو مولا چُپ سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب مؤذن اذان کی تیسری کڑی پر پہنچا تو اس نے دونوں کلمے کی انگلیاں انگوٹھوں سے ملا کر

ہونٹوں سے لگالیں اور پھر انھیں اس انداز سے چوما کہ ہونٹوں کے ملنے اور کھلنے سے ایک شیریں اور پرخلوص بوسے کی نہایت واضح آواز پیدا ہوئی، پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور انگوٹھوں سے ملی ہوئی کلمے کی انگلیاں اسی حالت میں پپوٹوں پر پھیر کر کلمہ کا ورد کرتا ہوا پھر ڈنڈ پیلنے لگا۔

"جیتے رہو پٹھے!" قریب سے آواز آئی۔

مولا بغیر ادھر اُدھر دیکھے مسکرا دیا۔ اس نے کوئی بات نہ کی اور اگر وہ بات کرتا تو اُستاد شاید اس کے ایک طمانچہ مار دیتا۔ استاد ہی نے تو مولا کو بتایا تھا کہ ڈنڈ پیلتے میں بات نہیں کرتے ہیں کیونکہ اس سے ورزش کرنے والے کا دم ٹوٹ جاتا ہے اُستاد آج کی طرح ہر روز اکھاڑے پہنچتے ہی انہی الفاظ میں مولا سے مخاطب ہوا کرتا تھا "جیتے رہو پٹھے" اور ان تین لفظوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ یہ سنتے ہی مولا پہلوان کا چوڑا چکلا سینہ پھیل جاتا، بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آتیں، گردن کی رگیں تن جاتیں اور اس کا کسرتی بدن نکھر کر مردانہ دبدبہ، جبروت اور بے پناہ قوت کا جیتا جاگتا مجسمہ بن جاتا۔

"کدال لگاؤ بیٹا۔" اُستاد نے اپنا کُرتا اُتارتے ہوئے کہا۔

وزیرا جھٹ پٹ کدال سے اکھاڑے کی سیاہی مائل بھربھری مٹی الٹ پلٹ کرنے لگا۔

استاد نے اپنا کُرتا اور شلوار اتار کر نیم کے جھکے ہوئے پیڑ کی ایک ٹہنی پر ڈالے تو دوسری ٹہنی پر لٹکی ہوئی مولا کی لٹھے کی شلوار، ململ کا کُرتا اور کالے رنگ کا صافہ جھولنے لگا۔ شاخوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں چہچہا اٹھیں۔ صبح کے اُجالے

نے پھیل کر مولا کے بدن کے پیچ وخم نمایاں کر دیے۔ اُس کا گندمی بدن تیل میں تربتر تھا۔ اُس گندمی سخت اور گٹھے ہوئے جسم پر سے پسینے کے قطرے پھسل پھسل کر مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

"پٹھے، اس آٹھویں گاؤں سے کُشتی جیت گئے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟" اُستاد اپنا لنگوٹ درست کرتے ہوئے بولا۔

مولا ڈنڈ پیل چکنے کے بعد دم سادھے کھڑا تھا۔

"کیا ہو گا استاد؟" مولا نے منہ سے ہوا نکال کر پوچھا۔

"گاؤں والے تیرا جلوس نکالیں گے۔" اُستاد نے اپنی کلائی ایک لاٹھی کی طرح مولا کی گردن پر مارتے ہوئے جواب دیا۔

استاد کی کلائی گدا کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"پٹھے، سات گاؤں سے کشتی جیت چکے ہو، علی کی مدد سے آن کی آن میں فیصلے ہوتے رہے، اب اگلے اتوار کو رحیما پہلوان سے مقابلہ ہے۔" اُستاد نے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر ٹپکاتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔" اور رحیما کو چت کر دینا تو تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں کل رحیما کے گاؤں گیا تھا۔ وہ اکھاڑے میں دم بھر وا رہا تھا۔ ڈیل ڈول میں اچھا ہے مگر داؤ پیچ میں ابھی کچا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے مولا نے استاد کی طرف دیکھا پھر نہایت ادب سے پوچھا۔

"اجازت ہے اُستاد؟"

اُستاد نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

مولا نے اکھاڑے کی سیاہی مائل بھُربھُری مٹی دائیں ہاتھ میں مسل کر وہیں

چھوڑ دی اور پھر یا علی کہہ کر اکھاڑے میں کود پڑا۔ آنکھ جھپکتے میں وزیرا اور نظیرا اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اُستاد اپنی ران پر دائیں ہاتھ سے تیل ملتے ہوئے مولا کے داؤ پیچ، پھرتی اور قوتِ بازو کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے لگا۔

اُبے او مولے۔" گلی سے آواز آئی۔

"جی اُستاد۔" چھت پر سے جواب ملا اور پھر مولا پہلوان بنیان اور شلوار پہنے ہوئے منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے گلے میں چاندی کا تعویذ چاندنی رات میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں منڈیر پر دائیں بائیں ٹکا کر ٹانگیں نیچے لٹکا دیں۔

"سانگ دیکھنے نہ جانا، پٹھے، رت جگا پہلوانی کا دشمن ہے۔ پچھلی مرتبہ تجھے معاف کر دیا تھا۔ اب کے گیا تو تیری ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔" اُستاد نے یہ کہتے ہوئے مولا کی پنڈلی پر زور سے ایک گھونسا مارا اور پھر اپنا صافہ درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مولا مسکرانے لگا اور حسبِ عادت مسکراتے ہوئے اُس نے اپنی موٹی تازی گردن کو دو بار جھٹکا۔ چاند کی ترچھی کرنوں میں، چھت پر پھیلے ہوئے مولا کے دیو ہیکل سائے نے بھی دفعتاً دو بار جنبش کی۔

خبردار، خبردار۔ گاؤں کے مشرقی حصّہ سے پہرہ داروں کی آوازیں سنائی دیں۔ نابینا الف دین، لاٹھی ٹیکتا ہوا، بڑی گلی کے نکڑ سے مڑ کر چھوٹی گلی میں گم ہو گیا۔

مولا، مقابل کے مکانوں کی دیواروں پر چپکے ہوئے اُپلوں کی طرف دیکھنے لگا

پھراس کی نگاہیں کچے مکانوں کی چھتوں پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئیں۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں کی مشترک چھتوں نے یہاں سے وہاں تک پھیل کر ایک طویل چھت کی صورت اختیار کر رکھی تھی، جس پر بان سے بُنے ہوئے کھٹولے، چارپائیاں، حُقے اور پانی سے بھرے کورے گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ سوائے چند ایک بڑی بوڑھیوں کے وہاں اور کوئی نہ تھا۔ لوگ، کوئی دو میل دور ایک گاؤں میں سوانگ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے نمبردار کے اکلوتے بیٹے کی شادی پر بڑے نامی مِراثی سوانگ بھرنے کے لیے بلوائے گئے تھے۔

"خبردار، خبردار" کی آوازیں لمبے لمبے وقفوں کے بعد خاموشی توڑ رہی تھیں۔

اگر اس وقت چاندنی نہ ہوتی تو تمام گاؤں پر چھایا ہوا سکوت بڑا وحشتناک معلوم ہوتا۔ مگر تھوڑی دیر بعد تو تاریکی پھیل ہی جائے گی۔ اس لیے کہ ساتویں کا چاند نئی نویلی دُلہن کی طرح شرما کر اپنا چہرہ سیاہ بادلوں کے آنچل میں چھپا لے گا اور پھر رات کی سیاہ زلفیں ہر شے کو اپنے حلقے میں اسیر کر لیں گی —— پھر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھیتوں کے بیچوں بیچ دوڑتی ہوئی پگڈنڈیاں سجھائی نہ دیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے باشندے اندھیرا چھا جانے سے پہلے پہلے گھروں سے نکل گئے تھے۔

مولا پہلوان منڈیر پر بیٹھا ہوا، ٹانگیں نیچے لٹکائے شمال کی جانب دیکھنے لگا۔ اُسی سمت کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا جہاں وہ چھ ماہ قبل سوانگ دیکھنے گیا تھا۔ وہیں اُس کی ریشماں سے اچانک ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی اور اِتنی مختصر کہ مولا کو صرف ایک لانبا سا قد، اور دو بڑی بڑی روشن آنکھیں یاد تھیں۔ اُس رات سوانگ ختم ہونے کے بعد سیکڑوں مرد

اور عورتیں ڈھلوان راستہ پر چلتے ہوئے چوراہے کی جانب آرہے تھے، جہاں پہنچ کر دُور سے آئے ہوئے مسافروں کو بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر جانا تھا اور قرب و جوار سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنے اپنے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈیاں پکڑ لینی تھیں رات اتنی بھیانک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا، چلتے چلتے اچانک موّلا کا کندھا ریشماں کے کندھے سے ٹکرا گیا۔

"کون؟"

"مولا، اور تو کون؟"

"ریشماں۔"

ایک خاموش لمحہ، ایک چپ چاپ ساعت، کرن بن کر رات کی تاریکی میں کوندی اور پھر ریشماں نے آہستہ سے کہا۔ "تو نے مجھے دھکا دیا ہے۔"

"جان بوجھ کر نہیں۔" موّلا نے بڑے نرم لہجہ میں جواب دیا۔

اور پھر ریشماں نشیب کی طرف بڑھتے ہوئے قافلہ میں گم ہو گئی۔ مولا جیسے چوکڑی بھول گیا ہو، ایک لانبا قد اور دو روشن آنکھیں اس کے ذہن کو ایک دھچکا لگا کر آناً فاناً غائب ہو گئیں۔ ریشماں کی آواز مسلسل کئی دن تک مولا کے کانوں میں گونجتی رہی اور پھر وقت کے دھارے پر بہتے بہتے وہ لانبا قد اور دو روشن آنکھیں ایک خواب بن گئیں۔ وہ ملاقات بذاتِ خود ایک خواب تھی اور پھر وہ خواب بھی جب خواب ہو گیا تو اکھاڑے کی "ہاوں ہو نہہ" اور بادام پستہ گھوٹنے کی آوازوں میں لاکھوں لمحات کے قافلے نے چند ساعتوں کی واردات کو اپنی لپیٹ میں لے کر پس پشت ڈال دیا۔ گو اس واقعہ کی یاد کا تسلسل ٹوٹ گیا تاہم کبھی کبھی مولا کے دل کے کسی نامعلوم گوشے

سے ایک کسک سی، ایک بے قراری سی، سر اٹھاتی، اور پھر چھائیں مائیں ہو جاتی۔

پھر ایک دن مولا نے ریشماں کو دن کے اُجالے میں بھرپور دیکھا۔

اس دن پیر جی کا عرس تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے جوق در جوق مزار کی طرف جا رہے تھے۔ بانکے مردوں نے کلف لگے ہوئے صافے اس ڈھنگ سے باندھ رکھے تھے کہ ایک کے بجائے دو دو شملے دائیں بائیں سے نکلے ہوئے تھے۔ عورتوں کے ہونٹوں پر دنداسے کی بھوری بھوری چمک تھی اور آنکھوں میں سُرمے کی کالی کالی بدلیاں۔ مردوں نے ڈوری دار پائینچوں والی شلواریں پہن رکھی تھیں۔ کوئی ہاتھ میں حقہ لیے ہوئے تھا اور کسی کے کاندھے پر بچہ بیٹھا ہُوا جلیبیاں کھا رہا تھا۔ نئی نویلی دُلہنوں کے گوٹے دار کیسری دوپٹے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سرسوں کا تیل لگا کر گوندھی ہوئی بھاری بھاری چوٹیاں رنگ برنگے کپڑوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ چاندی کے بالے جھوم جھوم کر رخساروں کو چوم رہے تھے۔ ایک بھولی بھالی دوشیزہ کی ناک میں سونے کی لونگ ایک ننھے سے سُورج کی طرح چمک رہی تھی، اور اُس ننھے سے سورج کی شعاعوں میں پوٹھوہار کی بھرپور زندگی اور وہاں کے میلے ٹھیلوں کی گہما گہمی جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ سُگھڑ عورتوں کے سر پر پوٹلیاں تھیں جن میں باجرے کی میٹھی روٹیوں یا اچار اور تنوری روٹیوں کے توشے تھے۔ کوئی سائیں کی بیتیں گنگناتا جا رہا تھا اور کسی کے ہونٹوں پر یوسف زلیخا کے بول تھے۔ بلا کی چہل پہل تھی جس میں قدرت برابر کی شریک تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔

اُس دن مزار کی طرف جاتے ہوئے مولا جب ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں تھوڑی دیر رُکا کہ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کچھ لوگ ٹیلے سے اُتر کر

نشیب میں پہنچ چکے تھے۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں۔ ایک عورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مولا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صورت جانی پہچانی ہو۔ مزار تک پہنچتے پہنچتے، دُھندلے دُھندلے نقوش اور بھُولی بھُولی سرگوشیاں مولا کے تحت الشعور سے اُبھر کر اُس لانبے قد اور دو روشن آنکھوں میں کھو گئیں۔ ریشماں نے مولا کو دیکھتے ہی جھٹ جُوتے بغل سے نکال کر پاؤں میں پہن لیے۔ گلابی دوپٹا قرینے سے اوڑھ لیا۔ سرمگیں آنکھیں جُھک گئیں، دنداسے سے رنگے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری، ایک دلآویز مسکراہٹ کھیل گئی۔ اتنے میں ایک چنچل عورت نے اس کے چٹکی لے کر پوچھا: "ریشماں، مزار پر کونسی منّت مانگو گی؟" ریشماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ چاپ چلتی رہی ۔ کچے راستے پر سیکڑوں پاؤں اپنے نقوش چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اُن میں ریشماں کے پاؤں کے نقوش بھی تھے۔ اور مولا کے پاؤں کے بھی ۔ دونوں ہر نقش میں کچھ پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے چل رہے تھے۔ جب مولا نے مزار کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو دیکھا کہ اُستاد، وزیرا اور نظیرا سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ احتراماً مولا بھی اُستاد کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اتنی دیر میں ریشماں بھیڑ میں گم ہو گئی۔ پھر استاد، وزیرا اور نظیرا کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف نکل گیا۔ اور مولا مزار کے اندر چلا گیا۔ مولا نے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا مگر ریشماں کہیں نظر نہ آئی۔ جب وہ محراب کے نیچے سے جھک کر باہر نکلا تو اس کی نگاہیں کنوئیں پر جا پڑیں جو مزار سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ وہاں عورتیں کنوئیں سے پانی نکال نکال کر

لوگوں کو پلا رہی تھیں۔ ریشماں جگت پر بیٹھی ہوئی اوک سے پانی پی رہی تھی۔ مولا مزار کی آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ریشماں نے پانی پی کر دوپٹے کے آنچل سے ہونٹ پونچھے، پھر اس نے کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھا، جیسے اس کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ مولا کو دیکھتے ہی اس نے فوراً ایک عورت کے ہاتھ سے ڈول لے کر کنوئیں میں ڈال دیا، اور پھر ڈوری اُوپر کھینچتے ہوئے بدستور مولا کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی نظریں کہہ رہی ہوں۔ "تجھے پیاس نہیں لگی؟" مولا اُٹھ کر کنوئیں کے قریب چلا گیا۔ اور پھر دو پتھروں پر پاؤں جما کر بیٹھ گیا۔ ریشماں پانی سے بھرا ڈول دونوں ہاتھوں میں لے کر کنوئیں کی جگت پر جھک گئی۔ مولا نے اوک پھیلا دی۔ ریشماں آہستہ آہستہ پانی گرانے لگی۔ ٹھنڈے، میٹھے اور شفاف پانی کا ایک ننھا سا جھرنا مضبوط ہاتھوں سے ٹکرانے لگا اور مولا کی آنکھیں بجائے پانی کے ریشماں کا چہرہ تکتی رہیں۔ مولا کی بڑی بڑی مونچھیں پانی میں تر بتر ہو گئیں۔ مولا نے لاکھ نفی میں سر ہلایا مگر ریشماں نے ڈول خالی کر کے ہی چھوڑا۔ اور پھر وہ پلّو منہ میں ٹھونس کر کھنکنے لگی۔

"ریشماں" مولا نے وہیں بیٹھے بیٹھے آہستہ سے کہا۔

"جی۔"

"تو کس گاؤں کی ہے؟"

"یہ پوچھنے والے تم کون۔"

"میں تیرے گاؤں آؤں گا۔"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"میں خود آؤں گی؟"

"کب؟"

"چاند کی اکیسویں کو۔"

"کہاں؟"

"اے ریشماں!" دُور سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"کیکر کے جنگل میں۔" ریشماں جلدی سے کہہ کر بھاگ گئی۔

چاند کی اکیسویں آئی اور گزر گئی۔ مولا کیکر کے جنگل میں آنکھیں فرشِ راہ کیے بیٹھا رہا۔ مگر ریشماں کے پاؤں کی چاپ سُنائی نہ دی۔ تمام رات اُس نے انتظار میں کاٹ دی اور پھر وہاں سے اُٹھ کر وہ سیدھا اکھاڑے چلا گیا۔ اس دن اس کی اُٹھا بیٹھی میں وہ جوش و خروش نہ تھا، ڈنڈ پیلنے میں شہ زوری کی وہ آب و تاب نہ تھی۔ اسی وجہ سے استاد نے اُسے بہت گھُرکا۔ اس دن استاد سے سُنی ہوئی باتیں مولا کے ذہن میں گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں۔ اُستاد اکثر کہا کرتا تھا کہ "عورت کا خیال پہلوانی کے کس بل توڑتا ہے۔" مولا دل ہی دل میں بڑا نادم ہوا۔ چنانچہ اس نے ریشماں کی یاد کو جھنجھوڑ کر دل سے نکال دیا اور پورے عزم و استقلال سے استاد کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے لگا۔

لیکن آج رات جب کہ وہاں سے کوئی دو میل دُور نمبردار کے گھر کے وسیع آنگن میں مراثی سوانگ بھر رہے تھے تو مولا کے دل میں چھ ماہ قبل کی یاد تازہ ہو گئی۔ اور اس یاد کو طول دینے میں ماحول کی خاموشی کا بڑا حصّہ تھا۔ اگر گلی میں روزمرّہ کی

طرح آمدورفت ہوتی، مکانوں کی چھتوں پر لوگ ہوتے تو مولا ایک لمحہ کے لیے بھی اس طرح منڈیر پر نہ بیٹھ سکتا۔

چاندنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ مولا کے گھر کے صحن میں شہتوت کے پیڑ کا سایہ جس نے گوبر اور مٹی سے لپے ہوئے فرش پر اندھیرے اور اجالے کا جال بُن رکھا تھا، آہستہ آہستہ تاریکی میں گھلنے لگا۔ ناند کے پاس جگالی کرتی ہوئی بھینس ایک تاریک ڈھیر کی صورت اختیار کرنے لگی، ہوا کے جھونکے گوبر کی بدبو پھیلانے لگے۔ خیرو گوجر کی کالی بلی کود کر چپکے سے مولا کے اُجلے بستر پر جا بیٹھی۔ مولا پہلوان کے گھر کی چھت پر دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مگر بستر ایک پر لگا ہوا تھا جس پر وہ خود سوتا تھا۔ دوسری چارپائی جس پر اس کا باپ سوتا تھا خالی پڑی تھی۔ تقریباً دو ماہ سے اس کا باپ پنڈی گیا ہوا تھا جہاں اُس نے سرکاری عمارتیں بنانے والے بڑے ٹھیکیدار سے ٹیپ کرنے کا چھوٹا سا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ گو شہر میں وہ کسی شمار قطار میں نہ تھا مگر اپنے گاؤں میں بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اُسے بے حد شوق تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا مولا ملک کا سب سے بڑا پہلوان بنے۔ اُس نے ایک بھینس صرف مولا کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ باداموں کی بوری تو ہمیشہ گھر میں پڑی رہتی تھی۔ مولا کا باپ کہیں بھی ہوتا، بیٹے کی کُشتی دیکھنے کے لیے ضرور پہنچ جاتا۔ مولا جب ساتویں گاؤں سے کشتی جیتا تھا تو اس کے باپ نے اس کی ماں کی قبر پر پھولوں کے ہار چڑھائے تھے۔ اس نے لوگوں سے کہا تھا۔ ”میری عمر دس سال بڑھ گئی ہے۔“

اب اگلے اتوار کو وہ مولا کی آٹھویں کشتی دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔ اگر مولا نے یہ میدان مار لیا تو وہ رستمِ ضلع ہو جائے گا، تحصیلدار صاحب خود اپنے ہاتھ سے

انعام دیں گے۔

شیدو کمہار کے گھر سے مُرغیوں کی کُٹ کُٹ اُبھر کر پہرہ داروں کی آوازوں تلے دب گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ چاندنی کی آخری جھلک چپکے سے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ رات کی سیاہ زلفیں پودوں، پیڑوں، ٹیلوں اور پگڈنڈیوں پر پھیل گئیں۔ مولا پہلوان اسی طرح ٹانگیں نیچے لٹکائے منڈیر پر بیٹھا رہا۔

"پہلوان"۔ دفعتاً کسی نے آہستہ سے کہا۔

مولا نے چونک کر نیچے دیکھا۔

ایک شخص دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

مولا کُود کر زمین پر آ گیا۔

اجنبی نے مولا کے کان کے پاس منہ لا کر نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہا "تمہیں ریشماں بلا رہی ہے۔"

"کہاں؟"

"وہاں" اجنبی نے آسیب زدہ پیڑوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مولا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گلی سے نکل کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔ وہ ننگے پاؤں تیزی سے چلتا گیا۔ دھرتی کے سوندھے پن نے پکی ہوئی فصل کی بُو باس میں گھُل مل کر فضا میں تازگی اور زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ گیہوں کے کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے مولا کے طاقتور بازو پاؤں کی رفتار کے ساتھ ساتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور گیہوں کی بالیاں ان فولادی بازوؤں کی روانی کے تلے دائیں بائیں لچک لچک کر

سرنگوں ہوتی جارہی تھیں۔ جب مولا کا پاؤں پگڈنڈی پر ٹھیک پڑنے کی بجائے کنارے پر جا پڑتا تو کنارے کی مٹی بیٹھ کر کھیت میں جا گرتی اور مولا سنبھل کر دھپ سے قدم پگڈنڈی پر رکھ دیتا اور پھر دُونی تیزی سے چلنے لگتا۔ جب وہ فولادی جُثّہ عجیب و غریب سرعت کے ساتھ پگڈنڈی کا سینہ لرزاتا، گیہوں کی بالیوں میں ہلچل مچاتا، آسیب زدہ پیڑوں کے جھنڈ کے پاس پہنچا، تو وہی لانبا قد ایک درخت کے پاس کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر آہنی دیوار گلاب کی نرم و نازک پتّیوں میں بدل گئی۔ پھر ایک ایک پتی، ہر پتّی کا ایک ایک ریشہ، ہوا کے ہر جھونکے سے کلپنے لگا۔ جیسے مولا بہت کچھ کہنا چاہتا ہو اور کچھ نہ کہہ سکتا ہو۔ جیسے وہ سمجھنا چاہتا ہو کہ یہ کیا ہوا ہے، کیسے ہوا ہے، کیونکر ہوا ہے اور کچھ نہ سمجھ سکتا ہو۔

"مولے" ریشماں نے سرگوشی کی۔

"جی۔"

ایک جگنو آک کی ایک جھاڑی سے اُڑ کر دوسری جھاڑی پر جا بیٹھا۔ کوئی پرندہ نہایت تیزی سے اُڑتا ہوا مولا کے قریب سے گزر گیا۔

"میں اُس دن نہ آسکی، مجبوری تھی، ناراض ہو گئے ہو؟"

"نہیں۔"

"دو باتیں ہیں۔"

"کیا؟"

"مجھے ابھی اپنے ساتھ گھر لے جاؤ گے یا بیاہ کر لے جاؤ گے؟ بولو کونسی بات پسند ہے، پہلی کہ دوسری؟"

"دوسری۔" مولانے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

"تو پھر اتوار کو کشتی نہ لڑنا۔"

"کیوں؟"

"رحیما میرا بھائی ہے۔"

آناً فاناً گلاب کی نرم و نازک پتیوں نے آہنی دیوار کی صورت اختیار کر لی۔ ریشماں کی آواز ہتھوڑا بن کر آہنی دیوار سے ٹکرائی اور اس ٹکراؤ کے شور سے مولا کے کانوں کے پردے لرزنے لگے۔ اُس کی گردن کی رگیں تن گئیں، بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئیں، اور اگر اندھیرا نہ ہوتا تو شاید ریشماں مولا کی سُرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر کانپ اُٹھتی۔

"میں کشتی لڑوں گا۔" مولا میں پہلوان کی انا نے تن کر کہا۔

"نہیں مولے، تم ہار گئے تو بھی بُرا، رحیما ہار گیا تو بھی بُرا۔ اگر کشتی ہو تو نہ جیت ہو نہ ہار، بازی برابر کی رہے، اگر تم جیت گئے تو وہ تمہیں قتل کروا ڈالیں گے۔ تم ہار گئے تو میرا مان ٹوٹ جائے گا۔"

یہ سُن کر مولا نے زور سے قہقہہ لگایا، کچے راستہ پر تھوڑی دُور بیل گاڑی میں بیٹھی ہوئی دو دیہاتنوں نے کان کھڑے کر لیے اور گاڑی بان نے اپنی چادر سر پر لپیٹ کر چھوی سنبھال لی۔ بیلوں نے حرکت کی اور اس حرکت کے ساتھ ساتھ بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔

ریشماں بولی۔ "یہ بیل گاڑی ہماری ہے۔ میرے ساتھ میری ہمجولیاں ہیں۔ ہم سانگ دیکھنے جا رہے ہیں، تمہیں بُلانے کے لیے کالو گیا تھا۔ وہ ہمارا نوکر ہے۔"

"اس دن کے بعد میں تو تمھیں بھول ہی گیا تھا۔" مولا نے زبان پہ آئی ہوئی بات کہہ ڈالی۔

"میری ہمجولیاں بھی یہی کہتی تھیں۔" ریشماں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

چوڑیوں کی جھنکار سُن کر مولا کو یوں محسوس ہوا جیسے ریشماں اور قریب آ گئی ہو۔ حالانکہ وہ ایک قدم پیچھے کو ہٹ گئی تھی، احساسات سامعہ سے بہت آگے نکل گئے۔ مولا کے مضبوط ہاتھ خود بخود آگے بڑھنے لگے حتّٰی کہ اس کی سخت اُنگلیوں نے نرم نرم کلائی کو پکڑ لیا۔

"نہیں مولے، میں جاٹ کی بیٹی ہوں، لاڈو ہاتھ۔" ریشماں نے خود اعتمادی کے انداز میں اپنا ہاتھ مولے کے ہاتھ سے ملاتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "تم بہادر ہو اور بہادر قول نہیں ہارا کرتے، کشتی برابر کی رہے۔" یہ کہہ کر ریشماں تیز تیز قدموں سے بیل گاڑی کی طرف نکل گئی اور مولا کے سینہ سے اُٹھی ہوئی گرج حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ لب نہ کھول سکا۔ بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن کم ہوتے ہوتے بالآخر خاموش ہو گئی۔ مولا سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ کچھ سوچتا ہوا، اپنے دائیں ہاتھ میں ایک نرم نرم ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوا، جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو پہرے دار دُور سے چلّا رہے تھے۔ "خبردار، خبردار۔"

مولا اکھاڑے نہ گیا اور دوسرے دن اتوار تھا۔

مولا کا باپ باداموں کی بوری لے کر دو دن پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ پچھلے تین دن سے مولا میں ایک نمایاں تبدیلی پائی جا رہی تھی۔ اُس کی وہ چُستی اور داؤ پیچ کا منتھائے کمال

جس پر اس کے اُستاد کو ناز تھا، یکسر روبہ انحطاط ہو گیا تھا۔ مولا کسرت بھی دلجمعی سے نہ کرتا۔ کچھ کھویا کھویا سا نظر آتا، جیسے وہ کسی الجھن میں گرفتار ہو۔ باوجود انتہائی کوشش کے اُستاد اس تغیّر کی وجہ دریافت نہ کر سکا۔ ایک دن اطلاع ملی کہ مولا پہلوان نے امام دین درزی کی دکان پر حُقّے کے دو چار گہرے کش لگائے تھے اور اس کے بعد وہ کافی دیر تک کھانستا رہا تھا۔ یہ سُن کر مولا کے باپ کو بڑا صدمہ ہوا۔ جیسے اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا ہو۔ اُستاد کے دل پر ایسا چرکا لگا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر تمام گاؤں میں پھیل گئی۔ گھر گھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ چوپال میں ہر گفتگو رُخ بدل کر مولا پر آ جاتی۔ عورتیں کنوئیں پر اکٹھی ہوتیں تو بات ساس کے مظالم سے شروع ہو کر کُھسر پُھسر میں بدل جاتی اور اس کُھسر پُھسر میں مولا کا نام بار بار آتا۔ بچے نہایت دلچسپی سے اتوار کے دنگل کی باتیں کرتے۔ دراصل گاؤں کا ہر فرد بڑے اشتیاق سے اتوار کے دنگل کا انتظار کر رہا تھا۔ سب کو پورا وثوق تھا کہ مولا کشتی مار لے گا۔ وہ رستمِ ضلع ہو جائے گا۔ تحصیلدار صاحب خود اپنے ہاتھ سے اسے انعام دیں گے۔ گاؤں کا نام ہو گا۔ مولا کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے اور سجی ہوئی بیل گاڑی میں اسے بٹھا کر فتحمندی کے ترانے گاتے ہوئے رہتما کے گاؤں سے واپس آئیں گے۔ مگر اب یہ کایا پلٹ دیکھ کر ہر شخص بے دل سا ہو گیا۔ دنگل سے پہلا دن تو ہمیشہ ایک ہماہمی کا دن ہوا کرتا تھا۔ پستہ اور بادام گھوٹے جاتے۔ نظیرا اور وزیرا مولا کی مالش کرتے۔ پھر مولا چار چار پکڑ بازوں سے دم بھرواتا۔ مگر اس مرتبہ تو ایک عجیب بے رونقی سی چھائی ہوئی تھی۔ جوں جوں اندھیرا چھا رہا تھا۔ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ شام ہوتے ہی مولا چادر تان کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

لوگ مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے حقے گڑگڑاتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ کچھ سو گئے۔ کچھ جاگتے رہے۔ پیش گوئیاں ہوتی رہیں۔ استاد نے تمام رات آنکھوں میں کاٹی۔ نظیرا اور وزیرا مزار پر منت ماننے چلے گئے۔ مولا کے باپ نے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔

نور کے تڑکے استاد مولا کے گھر پہنچ گئے۔ ہزار سمجھانے بجھانے پر بھی مولا اکھاڑے نہ گیا۔

اُبھرتے ہوئے سورج کی سُرخی کیکر کے جنگل کے عقب سے پھوٹ نکلی۔ گھاس کی پتیوں پر شبنم کے موتی کانپ کانپ کر ٹوٹ گئے۔ گوالے خالی گاگریں ہاتھوں میں لیے شہر سے لوٹ آئے۔ چرواہے ریوڑوں کو ہانکتے ہوئے چراگاہوں کی طرف نکل گئے۔ مغرب کی طرف پھیلے ہوئے درختوں کے سائے آہستہ آہستہ گھٹتے گھٹتے گُم ہو گئے اور عین سر پر پہنچے ہوئے آفتاب کی روپہلی کرنوں نے دھرتی کے کونے کونے کو جگمگا دیا۔ مولا کے گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

اس وقت مولا پہلوان سرخ لنگوٹ کاندھے پر ڈال کر چپ چاپ ایک بیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور پھر بیل گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کا ایک قافلہ رحیما کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ کوئی دو کوس کا سفر طے کرنے کے بعد یہ قافلہ رحیما کے گاؤں پہنچا، وہاں کئی گاؤں کے لوگ اکھاڑے کے ارد گرد بیٹھے بڑی بے تابی سے مولا کا انتظار کر رہے تھے۔ جب مولا وہاں پہنچا تو لوگ اُٹھ اُٹھ کر اسے دیکھنے لگے اور پھر تحصیل دار صاحب کے اشارے پر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ توقف کے بعد منتظمین میں سے کسی نے اُٹھ کر اعلان کیا کہ ٹھیک چار بجے کشتی شروع ہو گی۔ ہجوم

کی بیتابی ایک ہلکی سی جھپکی لے کر دُونی ہو گئی۔ مولا نے بیل گاڑی کی اوٹ میں سُرخ لنگوٹ کس لیا۔

"وقت ہو گیا ہے۔ پہلوان اکھاڑے میں چلے آئیں۔" تحصیلدار صاحب نے حکم دیا۔

یہ سنتے ہی رحیما خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اُتر آیا۔ تالیوں کی آوازیں دُور دُور تک گونج اُٹھیں۔

رحیما ایک وجیہہ، سُرخ سُرخ گالوں اور بڑی بڑی مونچھوں والا قد آور جوان تھا۔ وہ اکھاڑے کے ایک کونے میں بھوُکے شیر کی طرح نتھنے پھُلا کر ترچھا ترچھا کھڑا ہو گیا۔

مولا آہستہ آہستہ وقار سے چلتا ہُوا اکھاڑے کے دوسرے کونے میں جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ تالیوں کی آواز ایک بار پھر گونج اُٹھی۔

آج مولا اکھاڑے میں قدم رکھنے سے پہلے اُستاد سے اجازت لینا بھُول گیا۔ آج اسے اکھاڑے کی مٹی ہاتھ میں لے کر مسلنا بھی یاد نہ رہا۔

منصف نے رسمی اور اخلاقی کارروائی کا اشارہ کیا۔

دونوں پہلوانوں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور پھر پیچھے ہٹ کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

بڑے بوڑھوں نے تسبیحیں رولنا شروع کر دیں۔ حقے گڑگڑانے لگے تحصیلدار صاحب نے سگریٹ سُلگا لیا۔

منصف نے کشتی شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

دونوں پہلوان آگے بڑھے، ایک قدم — دو قدم — تین قدم —

دونوں بالکل ایک دوسرے کے قریب آ گئے، دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ رحیما کی آنکھیں ہُوبہُو ریشماں کی آنکھوں سے ملتی تھیں۔

"تم بہادر ہو اور بہادر اپنا قول ہارا نہیں کرتے۔" ریشماں کی آواز مولا کے کانوں میں گونجنے لگی۔

دفعتاً رحیما تھاپ مار کر، بھوکے شیر کی طرح مولا پر جھپٹا، مگر ہاتھ اوچھا پڑنے کی وجہ سے دوسری طرف نکل گیا۔ جگہیں بدل گئیں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ تماشائیوں کو اپنی سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔

یکایک رحیما نے مولا پر پھر حملہ کیا اور اس دوران میں دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے مولا توبزا ٹھو ہے۔ جیسے وہ جان بچا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ اس مرتبہ دونوں پہلوان گتھم گتھا ہو گئے۔ مولا بری طرح رحیما کے شکنجے میں آ گیا، جیسے اب گرا اور اب گرا۔

"سنبھل کر پٹھے۔" یکایک مولا کے اُستاد کی آواز گونجی۔

یہ سنتے ہی مولا کا چوڑا چکلا سینہ پھیل گیا۔ بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ "یا علی" کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ رحیما کے شکنجے سے اس طرح نکل گیا جیسے کسی نے مکھن سے بال نکال کر پرے پھینک دیا ہو۔

مولا ایک بھوکے شیر کی طرح رحیما کی طرف بڑھا۔ پھر بڑی پھرتی سے رحیما کو اپنے فولادی بازوؤں میں سمیٹ کر پٹک دیا اور پھر چھلانگ لگا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا —

کلیوں کی پکار

پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں رات کی تاریکی میں گم ہو چکی تھیں۔

اسلم نشیبی راستے پر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جب پہلے بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچا تو برف باری پھر شروع ہو گئی۔ اُس نے رُک کر اپنے اُونی گلوبند اور کن ٹوپے کو درست کیا، اوور کوٹ کا کالر اوپر کو اٹھا لیا اور چھتری کھول کر دستانے پہنے ہوئے ہاتھ میں تھام لی۔ اس کے سیاہ رنگ کے بوٹ نرم نرم برف میں دھنس دھنس کر گہرے نشان بناتے آگے بڑھ گئے۔ سنسان راستے کے دونوں طرف لوہے کی نالی دار چادروں کی چھتوں پر برف کے گالوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لکڑی اور پتھّر کے بنے ہوئے مکان بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ البتہ اِکّا دُکّا کواڑوں کی درزوں سے روشنی باہر جھانک رہی تھی: بجز اس کے معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے مراقبے میں ہے۔ جیسے جیتی جاگتی زندگی کا کبھی اُدھر سے گزر ہی نہ ہوا ہو۔ لوگ کہتے تھے چڑھائی کا دوسرا نام بہار ہے اور اترائی کا خزاں۔ اسلم کے ملنے جلنے والے اکثر کہا کرتے تھے کہ ہنستی مسکراتی زندگی کی گہما گہمی جس تیزی سے یہاں

نمودار ہوتی ہے سال کے اس حصے میں اسی رفتار سے میدانی علاقوں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اسلم کے ساتھ سروے ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والے اس موسم سے بے حد نالاں تھے۔ مسلسل برف باری جب آمد و رفت کے سلسلے بند کر دیتی تو وہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر آگ تاپتے، چلغوزے کھاتے، نمکین چائے پیتے اور گذشتہ سیزن کی چہل پہل کو یاد کر کر کے وقت کاٹتے۔ لیکن اسلم کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اُسے اس ویرانی میں بھرپور زندگی کا احساس ہوتا۔ اُن خاموشیوں میں اُس کے کان فطرت کے گیت سنتے۔ جب وہ درختوں پر جمی ہوئی برف کی ٹیڑھی میڑھی ٹہنیاں اور پتے دیکھتا تو اس کے سوئے ہوئے جذبات آنکھیں مل کر جاگ پڑتے۔ ہر شے برف کی سفید اوڑھنی اوڑھ کر کنواری مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کرتی۔ ایک کشادگی سی، ایک پھیلاؤ سا، ایک نامعلوم وسعت سی اس کے چاروں طرف پھیل جاتی۔ اس میں خود مختاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ چند روز کے لیے اس کا رویّہ گھر کے ماحول کو بالکل بدل دیتا۔ ایسے میں وہ اپنی سب سے چھوٹی بچی یاسمین کو گود میں لے کر اُسے خوب خوب پیار کرتا۔ رات کا کھانا کھا لینے کے بعد وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ آلتی پالتی مار کر مندے پر بیٹھ جاتا اور مزے لے لے کر پوٹھوہار کی پہیلیاں کہتا۔ وہ پہیلیاں جو اس نے اپنی مرحومہ ماں سے سُنی تھیں اور اس کی ماں نے اپنی ماں سے اور یہ سلسلہ بہت دُور تک چلا گیا تھا، جب ہل، درانتی، کھرپے، کھیت اور کھلیانوں سے زندگی عبارت تھی۔ اسلم کو ایسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر اُس کی اہلیہ جمیلہ کا مرجھایا ہوا چہرہ کھِل اُٹھتا۔ وہ چپکے سے دنداسے کا ٹکڑا منہ میں ڈال لیتی۔ آنکھوں میں سُرمے کی دو دو سلائیاں پھیر لیتی۔ مُوباف کھول کر نئے سرے سے چوٹی گوندھتی۔ اُجلا دوپٹا شانوں پر ڈال لیتی۔ دنداسے

کی بھوری چمک اُس کے ہونٹوں کو تازگی اور شگفتگی بخش دیتی۔ دانت موتیوں کی لڑی بن جاتے۔ جب سب لڑکیاں سو جاتیں تو وہ اسلم کی چارپائی کی پائنتی بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگتی۔ اسلم کی پیشانی پر کوئی شکن نہ پاکر اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ وہ سرکتے سرکتے سرہانے کی طرف چلی جاتی اور چپکے سے اسلم کے ہاتھوں کی اُنگلیاں چٹخانے لگتی۔

اسلم آٹھویں بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچ کر لمحہ بھر کے لیے رُکا۔ یہ کھمبا اس نے نشان رکھ چھوڑا تھا۔ یہاں سے اُلٹے ہاتھ مڑکر اُسے وہ پگڈنڈی پکڑنی تھی جو سیدھی بھاگو دائی کے گھر کو جاتی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ٹھیک پانچ سو قدم کا فاصلہ تھا۔ گیارہ سال کے عرصے میں اسے یہ مسافت بارہا گھپ اندھیرے میں طے کرنی پڑی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے قدم گنتا چلا جاتا اور یوں کرنے سے اس کی اپنی آواز اس کی ساتھی بن جاتی۔ آج رات بھی وہ اسی انداز سے چل کر بھاگو دائی کے گھر تک پہنچا۔ اُس مختصر اور بوسیدہ مکان کے سامنے چیل، ناشپاتی اور بٹنگ کے پیڑ چپ سادھے کھڑے تھے۔ ان پیڑوں کے قریب ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ نقطۂ انجماد پر پہنچ کر بے آواز ہو چکا تھا۔ بھاگو دائی کے مکان کے دروازہ کی جھریوں میں سے لالٹین کی جھلملاتی لَو نظر آرہی تھی۔ اسلم نے برآمدے میں کھڑے ہو کر چھتری پر سے برف جھاڑی اور پھر دروازے پر دستک دے کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

ایک اجنبی شخص نے دروازہ کھولا۔

"ماسی بھاگو ..... " اسلم ابھی جملہ مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ وہ اجنبی شخص بول پڑا۔

"بھاگو دائی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اسلم دھک سے رہ گیا۔ چھتری تان کر وہ چپ چاپ

پلٹ کر پگڈنڈی پر ہولیا۔ کوئی دس دن پہلے جب جمیلہ کو جھوٹے درد ہوئے تھے تو بھاگو دائی اس کے گھر پر آئی تھی۔ اسلم کی ازدواجی زندگی کے گیارہ سال پورے ہو چکے تھے اس عرصے میں جمیلہ دس لڑکیاں جن چکی تھی پہلوٹھی کی رفعت سے لے کر ننھی یاسمین تک سب کی سب بھاگو دائی کے ہاتھ کی تھیں اب گیارھواں بچہ آ رہا تھا۔ ہر سال فطرت اسلم کو حقیقت کا ایک تلخ جام پیش کرتی جس کو پی کر اُسے اندر سے رونا اور باہر سے مسکرانا پڑتا۔ دس دن پہلے بھاگو دائی نے اپنے پاؤں سے جمیلہ کے کولھے دباتے ہوئے کہا تھا "گھر کا کام کاج کیے جاؤ بہورانی بڑی آسانی رہے گی۔ آنکھ جھپکتے میں معاملہ ہو جائے گا۔" یہ سُن کر اسلم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اُس نے سوچا تھا "کاش یہ معاملہ طے نہ ہونے پائے بھاگو دائی کیوں نہیں کہتی کہ بچے نے پیٹ میں حرکت بند کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ کہتی ہے۔ کوئی اندیشہ نہیں میں اس کے منہ سے ایک لفظ سننا چاہتا ہوں۔ خطرہ" لیکن جمیلہ تو تھی پرلے درجے کی ڈھیٹ، پاؤں بھاری ہوتا مگر گھر کا کام بے تکان کیے جاتی۔ چارپائیوں کی ادوائن کستی۔ پانی سے بھرے گھڑے اٹھا اٹھا کر گھڑونچی پر رکھتی۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کرتے وقت صندوق اور ٹرنک گھسیٹ گھسیٹ کر ادھر اُدھر کرتی۔ ان بے احتیاطیوں کے باوجود اس کے تانبے کے ہنڈے کو کوئی روگ نہ لگتا۔ بعض اوقات کچے پکے دنوں میں وہ اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر گھر کے پچھواڑے میں چلی جاتی پہاڑی پر چڑھتی اور پھر لدکڑے لگاتی اُترتی۔ یہ سب کچھ کرنے پر بھی جب اس کی ناف کے اردگرد درد نہ اُٹھتا تو وہ خود کو کوسنے دیتی اور ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں کو یاد کر کر کے کُڑھتی رہتی۔ وہ دن جب اسلم جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز سے پکارا کرتا تھا "جمیلہ رانی!" اور یہ سُن کر اس کے دل کا کنول کھل جایا کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو سچ مچ کی رانی محسوس کیا کرتی تھی۔

شادی کے تقریباً دس ماہ بعد پہلی لڑکی ہوئی۔ ننھی سی جان کی آمد نے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ اسلم کے چہرے پر دونی رونق آ گئی۔ خوشی سے اس کا سینہ پھیل کر یہ چوڑا

ہو گیا۔ زچہ گیریاں گائی گئیں۔ اپنے پرائے نے منہ میٹھا کیا اور جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں
دوسرے برس جمیلہ کے کھٹے میٹھے دن تھے کہ بڑی بوڑھیوں نے پیش گوئی کی "بیٹا ہوگا"
وہ بات سچی ثابت نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہر سال جمیلہ کھٹ سے لڑکی جن دیتی۔ جوں جوں لڑکیاں پیدا
ہوتی گئیں۔ جمیلہ کی مسرتوں پر اوس پڑتی گئی۔ اس کے کان اسلم کے منہ سے "جمیلہ رانی"
سننے کو ترس ترس کر مایوس ہو گئے۔ ہنس مکھ اور زندہ دل اسلم یکسر بدل گیا۔ تفکرات نے
اس کے چہرے کی آب و تاب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اب وہ بولتا کم اور سوچتا زیادہ تھا۔
ہاں اتنی بات وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "دو چار ہی کو موت آجائے تو شاید میں سکون کا سانس
لے سکوں۔" لیکن موت آنے کے بجائے دس کی دس لڑکیاں صرف زندہ ہی نہیں بلکہ
تندرست و توانا تھیں اور برساتی کھمبیوں کی طرح تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔

اسلم نے سن رکھا تھا کہ عورت کے لیے بچہ جننا زندگی اور موت کا سوال ہے۔
وہ سوچتا "یہ سراسر جھوٹ ہے۔" اس لیے کہ جمیلہ کا بچہ جننا تو اسی طرح تھا جس طرح چڑیا
بیٹ کر کے پر جھاڑے اور پھر دانہ دُنکا چگنے میں لگ جائے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جمیلہ
نے کھانا پکا کر سب کو کھلایا۔ برتن مانجھ کر کارنس پر رکھے اور پھر گرم گرم چائے
پی کر لیٹ گئی اور بھاگو دائی کے پہنچنے تک نیا کنارے جا لگی۔ یہ بات ضرور تھی کہ
سچے دردوں میں جمیلہ کی چیخیں نکل جایا کرتی تھیں۔ لیکن یہ چیخیں بھی اسلم کے احساسات
کی دیوار کو چھونے نہ پاتیں کیونکہ جب کبھی اسلم کو گردے کی تکلیف ہوتی تو درد کی
شدّت، چمک اور تندی اُسے موت کے دروازہ پر لا کر کھڑا کر دیتی۔ اس کے
خیال میں دردِ زہ گردے کے درد کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔

اسلم آٹھویں بجلی کے کھمبے کے قریب سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا۔ اس کا دم

اکھڑنے لگا۔ مارے سردی کے اس کے پاؤں تخ ہو رہے تھے۔ ناک کی پھنگی سُن ہوتی جا رہی تھی۔ برف کے گالے بدستور گر رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کا ذہن بھی اسی رفتار سے کام کرنے لگا۔ آج پھر اسے انہی خیالوں نے گھیر لیا جن میں وہ دس دن پہلے کافی دیر تک اُلجھا رہا تھا۔ جب بھاگو دائی چلی گئی تھی تو اس نے صندوقچہ کھول کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا تھا۔ بیبی سوپ، بورک پوڈر، روئی، ڈیٹول، سیفٹی پن اور دوسری چیزیں جو زچّہ اور بچّہ کے لیے ضروری تھیں۔ سرخ رنگ کا موم جامہ جوں کا توں لفافے میں پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے تکیے، رضائی اور توشک، رنگ برنگ کی قمیصیں اور فراک، ننھے ننھے اُونی موزے، سویٹر، کورے لٹھے کے لنگوٹ، ایک گٹھری جس میں دُھلے ہوئے پرانے لتّے بندھے تھے۔

اسلم نے محسوس کیا تھا کہ یہ گھناؤنا چکّر تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ چنانچہ سینکڑوں باتیں اس کے تحت الشعور سے اُبھر آئی تھیں۔ اُس نے سوچا تھا کیوں نہ بچّہ پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ پھر اس کے دل میں ایک اور خیال نے سر اُٹھایا تھا کیوں نہ جمیلہ ہی کا کام تمام کر دوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ پھر اُسے تیسرے خیال نے اُکسایا تھا۔ کیوں نہ رفعت کو سیر کے بہانے باہر لے جاؤں اور اسے پہاڑ کی چوٹی سے دھکیل کر بوجھ کم کر لوں۔ اس لیے کہ پہلوٹھی کی رفعت بڑی سرعت سے قد نکال رہی تھی۔ رُوکھا سُوکھا کھا کر بھی وہ غیر معمولی تیزی سے جوان ہو رہی تھی۔ اس کے بعد کی دو بہنیں بھی اُسی کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ سارے کُنبے کے لیے روٹی کپڑا مہیا کرنا وبالِ جان تھا۔ جہیز کے متعلق تو سوچنا ہی گناہ تھا۔ آج رات بھی اسلم اسی نہج پر سوچتا ہُوا مال روڈ سے اُتر کر چھوٹی سڑک پر پہنچا اور پھر تھوڑی دیر میں اس

پگڈنڈی پر چلنے لگا، جو سیدھی اس کے گھر کو جاتی تھی۔

"بھاگو دائی مر گئی۔ اب کیا ہو گا؟"

اس کی عقل پہلو بدل کر ٹھوس حقیقت کا جائزہ لینے لگی۔ برف باری کے موسم میں وہاں سوائے بھاگو دائی کے اور کوئی دائی نہیں پائی جاتی تھی اور اگر تھی تو اس کا اسلم کو علم نہ تھا۔ دفعتاً وہ محمود کا مکان دیکھ کر رُکا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ محمود اس سے کم تنخواہ پاتا تھا مگر ٹھاٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں اور دروازوں پر پھولدار کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی نفیسہ عمدہ عمدہ ساڑھیاں اور ان سے میچ کرتی ہوئی چولیاں پہنتی تھی، اس کے صرف دو بچے تھے جو کانونٹ میں پڑھ رہے تھے۔ اس کے پاس ریڈیو سیٹ، سلائی کی مشین اور بجلی کی استری کے علاوہ ایک قالین اور صوفہ سیٹ بھی تھا۔ محمود کے کہنے سُننے پر اسلم فلاش میں قسمت آزما چکا تھا۔ تاش کے پتوں کو تو جیسے اس سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ جب داؤں لگایا مات کھائی۔ ہر مرتبہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل گئی۔ رشوت کے متعلق بھی اس نے مہینوں سوچا مگر جیل کے خوف نے مُٹھی گرم نہ ہونے دی۔ یکایک اسلم رُک گیا۔ اس کا دایاں پاؤں اپنے گھر کی پہلی سیڑھی پر تھا۔ چھوٹا سا سرکاری مکان جس میں نل اور بجلی لگی ہوئی تھی۔ جس کا کرایہ برائے نام تھا۔ سردیوں میں ایندھن بھی رعائتی داموں سرکار سے ملتا تھا۔ ان سہولتوں کے باوجود پاؤں چادر سے باہر رہتے تھے۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم نے اپنا بایاں پاؤں دوسری سیڑھی پر رکھا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے بڑھ کر دروازے پر دستک دی اور پھر حسبِ معمول رفعت کو پکارا۔ چند ساعتوں کے بعد جمیلہ نے کُنڈی کھولی۔

"بھاگو دائی کا انتقال ہو گیا ہے۔" اسلم نے سپاٹ انداز میں خبر سُنائی۔

"ماسی بھاگو۔" جمیلہ نے دایاں ہاتھ چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اور کچھ کہے بغیر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اسلم نے چھتری کو اُلٹا کر برف جھاڑی اور پھر کمرے کے اندر داخل ہو کر کواڑ بھیڑ دیا۔ چھتری کو دیوار کے ساتھ مٹھ کے بل کھڑا کر دیا۔ بوٹ اُتار کر ایک کونے میں رکھے۔ کن ٹوپ، اوورکوٹ اور گلوبند اُتار کر کھونٹیوں پر لٹکائے اور پھر آتشدان کے پاس بیٹھ کر موزے اُتارنے لگا۔

مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں نو لڑکیاں جھلنگوں پر لحاف اوڑھے سو رہی تھیں۔ لحافوں کے کنارے چیکٹے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے سیون اُدھڑ گئی تھی۔ اُسی کمرے میں اسلم آتشدان کے پاس چھوٹے مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ آتشدان پر لگا ہوا لکڑی کا مچان سرخ چھینٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس پر ایک آئینہ، پلاسٹک کی سفید کنگھی، سیرپڈان کی ایک ٹکیہ، قینچی کے سگریٹ کا پیکٹ اور دیا سلائی رکھی ہوئی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں دو چارپائیاں آمنے سامنے دیواروں کے ساتھ بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر جمیلہ بے قراری کی گھڑیاں گزار رہی تھی۔ دوسری پر ننھی یاسمین سو رہی تھی۔ یاسمین اپنی ماں کے پاس سویا کرتی تھی۔ لیکن اِدھر ایک ماہ سے اُسے باپ کے ساتھ سونے کی عادت ڈلوائی جا رہی تھی۔ ایک کونے میں تپائی پر فیڈر، کاؤ اینڈ گیٹ کا ڈبہ اور گرم پانی سے بھری تھرماس پڑی ہوئی تھی۔

اسلم نے دو موٹی موٹی سوکھی لکڑیاں دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیں دھواں اٹھا۔ لکڑیوں نے آگ پکڑی۔ شعلے بلند ہوئے۔ مقابل کی دیوار پر اسلم کا سایہ لمبا ہو کر

عمودی رُخ میں بے تحاشا لرزنے لگا۔ باہر ہوائیں سیٹیاں بجانے لگیں۔ پالے کی لہریں بند دروازوں اور کھڑکیوں کی درزوں میں سے داخل ہو کر درجۂ حرارت کو اور نیچے گرانے لگیں۔ اسلم نے پہلے ہاتھ تاپے۔ پھر گرم ہتھیلیوں سے ناک ٹھوڑی اور گالوں کی ٹکور کی پھر اس نے ٹانگیں پسار کر پاؤں سینکے۔ آگ کی تپش سردی کو نرمانے لگی چند لمحوں کے بعد اس نے کھڑے ہو کر مچان پر سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا۔ آئینے میں اسے اپنا چہرہ خوفناک طور پر زرد دکھائی دیا کنپٹیوں کے بال بالکل سفید اور سامنے کے کھچڑی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔ اس نے مونڈھے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے یکے بعد دیگرے اُٹھ اُٹھ کر فضا میں تحلیل ہونے لگے۔ رفعت سے چھوٹی لڑکی کا ہاتھ لحاف سے باہر نکل کر لٹک رہا تھا۔ جھلنگوں کے پایوں پر کھٹمل چل رہے تھے۔ اسلم کے دماغ میں شعلے کوندنے لگے۔ مہیب آوازیں گونجنے لگیں۔ خلافِ معمول اس نے رفعت سے چھوٹی لڑکی کا ہاتھ لحاف سے نہ ڈھانپا۔ تیسری لڑکی نے بازو کھجلاتے ہوئے کروٹ بدلی۔ لحاف کا کونا الٹ گیا۔ برقی روشنی میں اس کی کلائی پر دو دوڑا نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ آج اسلم کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ کھٹمل اس کی بیٹیوں کا خون چوس رہے تھے۔

"ذرا نفیسہ بہن کو بلا لائیے۔" دوسرے کمرے سے جمیلہ نے بمشکل تمام کہا۔

اسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی جھلکنے لگی۔

یکایک یاسمین رونے لگی۔

"ذرا یاسمین کو دیکھیے تو۔ اسے بھوک لگی ہوگی۔" جمیلہ نے رُک رُک کر کہا۔

اسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی۔

"بھوکا تو میں بھی ہوں۔" اس کا دل بولنے لگا۔ "میرا بھی جی چاہتا ہے کہ صبح اُٹھ کر مکھن توس اور انڈے کھاؤں۔ مگر باسی روٹی کھا کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ قلم

گھستے گھستے میرے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ دانتوں سے کوڑی کوڑی پکڑ کر تیرا اور ان دس آفتوں کا پیٹ پال رہا ہوں۔ اب میں اس گیارھویں بچے کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

یاسمین زور زور سے رونے لگی۔

"جی بھر کر رو لو۔ روتے روتے دم توڑ دو۔ آج اس گھر پر موت کے سائے لہرا رہے ہیں۔" اسلم پاگلوں کی طرح خلا میں بولنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔ آئینے میں کنپٹیوں کے سفید بال اُسے گھورنے لگے۔ آنکھوں کے سیاہ حلقے اُس کا مذاق اڑانے لگے۔ چہرے پر چھائی ہوئی زردی نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے کانوں کی لَویں گرم انگارے بن گئیں۔ دماغ کھول اٹھا۔ اس نے آئینہ پکڑ کر فرش پر دے مارا۔ زور کا چھناکا ہوا۔ رفعت اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے لپک کر رفعت کو چُٹیا سے پکڑ کر چٹاخ چٹاخ دو چار تھپڑ جما دیئے رفعت سہم کر لحاف میں دبک گئی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" جمیلہ انتہائی مشکل سے اٹک اٹک کر بولی۔

"خاموش!" اسلم گرجا۔ اس کی خوفناک آواز کمرے میں گونجی۔ رفعت نے دم روک لیا۔ یاسمین کی گھگی بندھ گئی۔

دفعتہً جمیلہ نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اسلم کی رگِ پیشانی نے کھنچ کر دو گہری لکیریں نمایاں کر دیں۔ اس کا ارادہ پہاڑ بن کر ماضی، حال اور مستقبل کی چھاتی پر کھڑا ہو گیا اور اس پہاڑ کے سینے سے جوالا پھوٹ نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ اس کی تمام قوت انگلیوں میں سرایت کر آئی۔

جمیلہ کی چیخیں پھر کمرے میں گونجیں۔ بلند، طویل اور درد و کرب میں ڈوبی

ہوئی چیخیں، جیسے سِلوں کے نیچے پستے ہوئے انسان نے آخری بار پکارا ہو۔

اسلم کے قدم خود بخود حرکت کرنے لگے۔ تنی ہوئی گردن، بے لوچ بانہیں، پیشانی کی دو گہری لکیریں بدستور نمایاں، بھینچے ہوئے دانت، پلکوں کی جنبش بند، پتلیاں ساکت، اس نے خود حرکی کل کا روپ دھار لیا۔ وہ کل جسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچ کر ایک چار پائی پر جھکنا تھا۔ ایک ماں اور اس کے نوزائیدہ بچے کے گلے پر فولادی انگلیاں رکھ کر پوری قوت سے دبا دینا تھا۔ خود حرکی کل کے پاؤں دہلیز پر پہنچ کر رُک گئے۔

تپائی پر لکڑی کا صندوقچہ کھلا پڑا تھا۔ جمیلہ کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ ناک کا بانسا مڑا ہوا تھا۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چار پائی کی پٹیاں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں۔ سُرخ رنگ کا موم جامہ اُس کے نیچے بچھا ہوا تھا۔

ایک نئی زندگی طلوع ہو رہی تھی۔

خود حرکی کل کے پاؤں بڑھ کر پلنگ کے قریب چلے گئے۔ کل، پائنتی پر جھک گئی۔ فولادی ہاتھوں نے نوزائیدہ بچی کو تھام لیا۔

جمیلہ نے ایک گہرا سانس لے کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اُس کا انگ انگ ڈھیلا پڑ گیا۔ ایک ناقابلِ بیان سکون میسّر آگیا، جیسے کسی نے اس کے بدن سے کانٹا نکال کر پرے پھینک دیا ہو۔

فولادی ہاتھوں پر نرم نرم گوشت کا ٹکڑا بالکل بے جان معلوم ہوا۔ نہ کوئی جنبش نہ کوئی آواز، جیسے ننھے ننھے پھیپھڑوں نے پہلی حرکت کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

یکایک خود حرکی کل میں ایک لرزش سی ہوئی۔ تنی ہوئی گردن نے حرکت کی، بانہوں میں لچک آگئی۔ پلکیں جنبش کرنے لگیں۔ پتلیوں نے گردش کی۔ اسلم کا دل دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ ایک لمحہ اور...... اگر بچی کی آواز نہ آئی تو...... اسلم نے محسوس کیا، جیسے اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ اس کے بدن میں لہو کا ہر قطرہ طوفان بن کر صرف ایک نقطے کا طواف کرنے لگا۔

"جمیلہ رانی۔" اُس نے گمبھیر آواز میں پکارا۔

"جی۔" جمیلہ نے حیرت سے جواب دیا۔

"بچی روئی نہیں۔"

"اچھا ہوا۔"

اسلم کا تنفّس رُک گیا۔ جیسے اس لمحے سے پہلے کا سانس آخری سانس تھا اور دوسرے سانس کا اعتبار جاتا رہا ہو۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوزائیدہ بچی کے کولھوں کو تھپتھپایا۔ ننھّے ننھّے پھیپھڑوں نے حرکت کی۔ سُرخ سُرخ ہونٹ ہلے اور پھر آناً فاناً وہ معصوم جان رو رو کر زندگی کا ثبوت دینے لگی۔ اسلم نے محسوس کیا جیسے اس میں زندگی عود کر آئی ہو۔ ایک انجانی مسرّت کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے موتی اس کی آنکھوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔

دادُو

ٹیلوں کے اُس پار ڈھول کی دھمادھم گُونجی۔ شہنائیوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گاؤں کی عورتیں گھریلو دھندے جہاں کے تہاں چھوڑ لپک کر چھتوں پر چڑھ گئیں۔

دادُو سینہ تانے بیچ راستے کے کھڑا تھا۔ حسب معمول اس کے دائیں ہاتھ میں لٹھ تھا جس پر جڑے ہوئے پیتل کے کوکے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں میں چمک رہے تھے۔

بلند قامت، گٹھیلا بدن، بڑی بڑی مونچھیں، چہرے پر زخموں کے نشان، دائیں بائیں سے جھانکتے ہوئے صافے کے دو شملے، تانبے ایسی گردن میں تعویذ جس پر چاندی کا خول، ململ کا کُرتا، شلوار کے پائنچوں پر چوہرا چوہرا بخیہ۔ یہ سب کچھ تو پوٹھوہار کے علاقے میں دوسرے نوجوانوں میں پایا جاتا تھا، جن کی یاد میں دوشیزائیں ڈھولک پر رومان پرور گیت گاتی تھیں۔ کھیتوں میں درانتیاں چلاتے چلاتے لمحہ بھر کے لیے ہاتھ روک کر اپنے ماہیے کی دو چار باتیں کر کے

نئی توانائی حاصل کر لیتی تھیں۔ کنوئیں پر ہم راز سہیلیاں دوسروں کی حدِ سماعت سے بچ کر تصورات کا چاندی سونا سرگوشیاں کر کے آپس میں بانٹ لیتی تھیں۔ ڈھولک پر، کھیتوں میں، کنوئیں پر جب بات میں بات نکل کر دادُو کے نام تک پہنچ جاتی تو نوجوان لڑکیاں ناک بھوں چڑھا لیتیں۔ سگھڑ عورتوں میں دادُو کا ذکر چھڑتا تو اُسے جھولیاں بھر بھر کے بد دعائیں دیتیں۔ چوپال پر بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں دادُو کا نام آتا تو کان پکڑ استغفار پڑھتے۔ اور جب مائیں ضدی بچوں کو لوریاں دے دے کر تھک جاتیں تو "وہ دادُو آیا" کہہ کر انھیں ڈراتیں۔ نفرت اور خوف کی یہ لہریں اُس چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر پوٹھوہار کے تمام علاقے میں پھیل گئی تھیں۔ چوری ضلع کے صدر مقام میں ہوتی اور پولیس سب سے پہلے دادُو کے گاؤں کی تلاشی لیتی۔ قتل کی واردات خاص تحصیل میں ہوتی اور تھانے سے دادو کو بلاوا آ جاتا۔ اسی لیے وہ چھوٹا سا گاؤں بڑا بدنام تھا۔ وہاں کے باشندے دادُو سے اس لیے بھی نالاں تھے کہ وہ ہر بات میں پہل کرتا تھا۔ دیہاتیوں کے دلوں میں خوف تھا اور نفرت بھی۔ خوف کی فولادی انگلیوں نے نفرت کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ چنانچہ دادُو کے منہ پر بات کرنے کے لیے دل گردے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً اُس دن تو دادُو کی دھاک بیٹھ گئی تھی جس دن اُس نے پیتل کے چمکتے ہوئے کوکوں والا لٹھ بلند کر کے تحصیلدار کو بھگا دیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ بعد میں اُسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ لیکن یہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا اور پھر جیل کے اندر بھی تو دادُو کا طوطی بولتا تھا۔

آج بھی دادُو نے پہل کی۔ ڈھول کی پہلی ہی دھما دھم سُن کر وہ گھر سے باہر نکل آیا اور ایک پہاڑ بن کر بیچ راستے کے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے چند

بزرگ، کچھ نوجوان اور بہت سے بچے اُس پہاڑ کے آس پاس جمع ہو گئے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد برات پہاڑ کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ دولہا، سہرا باندھے، موتیا کی کلیوں سے سجی ہوئی بھوری گھوڑی پر سوار تھا۔ اس کے اِردگرد براتی کھڑے تھے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ سنّاٹا چھا گیا۔

"برات کہاں سے آرہی ہے؟" داڈو براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"شہر سے۔" جواباً آواز آئی۔

"آپ لوگوں کو آج رات یہاں رُکنا پڑے گا۔" داڈو نے تحکّمانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" براتیوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے پوچھا۔

"ہماری مرضی۔" داڈو نے یہ کہتے ہوئے لٹھ کو اپنے کاندھوں پر متوازی رکھ کر اُس پر دونوں بازو پھیلا دیئے۔

شہری آپس میں کُھسر پُھسر کرنے لگے۔

"آپ لوگ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔" پہاڑ کڑک کر بولا۔

ایک سفید ریش دیہاتی لاٹھی ٹیکتا ہوا مجمع میں سے باہر نکلا اور براتیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہمارے بزرگوں کے وقت سے یہ روایت چلی آئی ہے۔ آج تک کوئی برات یہاں رُکے بغیر آگے نہیں گئی۔"

"ہم وقت پر لڑکی والوں کے ہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔" ایک شہری بولا۔

"ہم نے ہمیشہ اپنی روایتوں پر وقت کو قربان کیا ہے۔" گاؤں کے ایک نوجوان نے سینہ تان کر کہا۔

"آپ لوگ رُکے بغیر چلے گئے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔" ایک بڈھے دیہاتی نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

جب شہریوں نے دیکھا کہ پہاڑ کو ہٹا کر آگے بڑھنا ممکن نہیں تو چار و ناچار انھوں نے دعوت قبول کر لی۔ پھر تو چوپال پر میلہ لگ گیا۔ اِدھر بکرا ذبح کر دیا گیا۔ اُدھر عورتیں آٹا گوندھنے لگیں۔ چھڑکاؤ ہو گیا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ چارپائیاں اور کھٹولے بچھ گئے۔ چلم کا دَور چلنے لگا۔ چھ سات عورتیں بیک وقت لوہ پر روٹیاں پکانے لگیں۔ کھانے کے بعد مراثیوں نے سوانگ بھرا۔ مارے قہقہوں کے شہری لوٹ پوٹ ہو گئے۔ دوسرے دن گاؤں کے مرد اور بچے براتیوں کے ساتھ چل کر شیشم کے پیڑوں تک گئے اور الوداع کہہ کر لوٹ آئے۔ مگر دادو ایک شیشم کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہیں گاؤں کی سمت جاتے ہوئے مردوں اور بچوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ قریب قریب ہر ایک نے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دادو جانتا تھا کہ اس موسم میں جب کہ فصل ربیع کٹ چکتی ہے کسان اپنے پھٹے پُرانے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنتا ہے۔ گندم بیچ کر قرض ادا کرتا ہے۔ بیٹی کا جہیز تیار کرتا ہے۔ دیوانی مقدمہ کی پیروی میں کسی نامی وکیل کے سامنے روپیوں کی ڈھیری لگا دیتا ہے۔ اور اگر روپہلے سکّوں کی جھنکار سن کر بدمست ہو جائے تو اپنے بھائی بند کا سر پھوڑ کر ضابطۂ فوجداری کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔

چند لمحوں میں مرد اور بچے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب دادو کے سامنے کچے مکان تھے جن کی دیواریں ساجھی تھیں۔ کہیں کہیں صحنوں میں اُگے ہوئے شہتوت،

بیر، لسوڑا اور نیم کے پیڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُس مختصر آبادی کے پرلے سرے پر مسجد کے گنبد نمایاں تھے۔

شیشم کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئے دادو نے اپنے گاؤں پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور پھر گردن موڑ کر ٹیلوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹیلوں کے پس منظر میں صاف و شفاف نیلا آسمان تھا۔ اُس نیلاہٹ کی وسعتوں میں چیلیں پر پھیلائے اُڑ رہی تھیں۔ وہ منظر دیکھ کر دادو اپنے بازوؤں کو سہلانے لگا۔ اس کا یہ ردِّ عمل غیر شعوری تھا اور جبلّی۔ تمام پرندوں میں اُسے چیل پسند تھی جس کو اُڑتے ہوئے دیکھ کر اُس کے اپنے دل میں اُڑنے کی امنگ جاگ اُٹھتی تھی۔ وہ آرزو اس کے دل میں اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب وہ بہت چھوٹا تھا اور آج بھی بچپن کی وہ خواہش جوں کی توں قائم تھی۔ دادو گردن جھکا کر لٹھ سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔ یوں کرتے ہوئے اُس کے ذہن میں چار دن پہلے کا واقعہ اُبھر آیا۔ جو اُس کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ اُس دن جاٹوں کی ڈھوک سے عورتیں اور مرد مریم کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ ایک عرصے سے بات چیت ہو رہی تھی۔ اب معاملہ مردوں تک پہنچا تو بات پکّی ہونے کے بجائے یکلخت ختم ہو گئی۔ مریم کے باپ نے راجپوتی جلال میں آ کر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ جاٹوں نے اس میں اپنی ہتک سمجھی۔ خون کا سا گھونٹ پی کر لوٹ گئے۔ مگر دوسرے دن انھوں نے مریم کے بڈھے باپ کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ لڑکی کو دن دہاڑے للکار کر اُٹھا لے جائیں گے۔ اُس دن دادو شہر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر جب یہ بات اُس کے کانوں تک پہنچی تو وہ مسکرا کر بولا "یہ دادو کا گاؤں ہے اور مریم اس گاؤں کی بیٹی ہے"۔

دفعتاً گھوڑے کے ٹاپوں کی کٹ کٹ سنائی دی۔ دادو لٹھ لے کر راستے میں

جم کر کھڑا ہو گیا۔ سوار نے قریب پہنچ کر باگیں کھینچ لیں۔ دادو نے لپک کر بائیں ہاتھ سے لگام پکڑ لی۔ لٹھ زین پر رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ سے سوار کو کھینچ کر نیچے اُتار لیا۔ دادو کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر نووارد کے پسینے چھوٹ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دادو نے بڑے اعتماد کے ساتھ نووارد کی جیبوں کی تلاشی لی۔ کل پچیس روپے نکلے۔ نوٹ شلوار کے نیفے میں اُڑس کر اُس نے مسافر کو سہارا دے کر زین پر بٹھایا اور پھر گھوڑے کی ٹانگ پر اس زور سے لٹھ مارا کہ جانور تڑپ کر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ گھوڑے کے پاؤں میں جڑے ہوئے نعل کچے راستے کا سینہ کوٹنے لگے۔ یہاں سے وہاں تک دھول کے بادل چھا گئے جس میں چند ساعتوں کے لیے تھوہر اور آک کے خود رو پودے چھپ گئے۔ کنوئیں سے لوٹ کر آتی ہوئی دیہاتنیں رُک کر سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچے مکانوں کے نکڑ پر اُپلے تھاپتے ہوئے ہاتھ یکایک رُک گئے۔ گلی کے سرے پر کتوں نے شور مچا کر بچوں کو ڈرا دیا۔ ایک سفید بچھڑا چھینکے میں کسا ہوا منہ ہوا میں لہراتا، گلیلیں بھرتا ریل کی پٹری کی سمت نکل گیا۔ جب گرد کے بادل چھٹ گئے تو سامنے سے آتی ہوئی جانوں دکھائی دی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس کے سر پر پوٹلی تھی اور اس پوٹلی کے اُوپر جوتا۔ اُس نے پہلوٹھی کا بچہ کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ دادو نے پہل کی۔ بڑھ کر جانوں سے خیر خیریت پوچھی۔ بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں گاؤں کا نمبردار آ نکلا۔ زری کلاہ پر بندھی ہوئی پگڑی کا کلف دار طرّہ دیکھ کر بچہ ہمکنے لگا۔ نمبردار نے جانوں کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ جیب سے دونّی نکال کر بچے کے ہاتھ میں تھمائی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا شہر کی طرف نکل گیا۔ دادو، جانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے

باتیں کرنے لگا۔ اور پھر جانوں کی آنکھ بچا کر بچے کے ہاتھ سے دونّی مار کر جوہڑ کی طرف کھسک گیا۔ جانوں کی مڈبھیڑ گاؤں کی چند عورتوں سے ہو گئی۔ ایک نے بچّہ گود میں لے لیا۔ دوسری نے پوٹلی تھام لی۔ تیسری گلے ملنے لگی۔ جانوں گلی میں داخل ہوئی تو مردوں اور بچّوں نے بھی بڑے تپاک سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ جانوں — گاؤں کی بیٹی — شادی کے بعد پہلی مرتبہ میکے آئی تھی۔

جوہڑ کی سیاہ اور چکنی مٹی میں بھینسیں لوٹ رہی تھیں۔ نوجوان چرواہے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے، بڈھے گڈریے سے راجہ رسالُو کی تیراندازی کا قصّہ سُن رہے تھے۔ وہاں سے کچھ دُور، سرکنڈوں کے پیچھے، ایک بھینس کیکر کے پیڑوں تلے آرام سے بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ دادُو نے چپکے سے بھینس کی پسلیوں پر لٹھ کا کونا مارا۔ بھینس تھوتھنی جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ دادُو نے چمکارتے ہوئے بھینس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ بھینس دُم ہلانے لگی۔ پھر اُس نے گردن موڑ کر میلی میلی آنکھوں سے دادُو کی طرف دیکھا۔ دادُو چُپکے سے پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ تھنوں کو باری باری مُٹھی میں لے کر دودھ کے اُتار میں حرکت پیدا کی۔ چاروں تھن تن کر بے قرار ہو گئے۔ دادُو نے اپنا منہ کھول کر تھنوں کی سیدھ میں کر لیا اور پھر اُوپر تلے سن سن کرتی دھاریں پینے لگا۔ یوں کرتے میں ہمیشہ اُس کے حلق میں گُدگُدیاں سی ہوا کرتی تھیں۔ جب بھینس کی کھیری چھیچھڑا بن کر ڈھلک گئی تو اُس نے اپنے چہرے پر سے دودھ کے قطرے صافے کے کونے سے پونچھے اور پھر دبے پاؤں سائیں میراں کے مزار کی طرف نکل گیا۔

سائیں میراں کا مزار میدان کے عین وسط میں واقع تھا۔ گاؤں کے لوگوں کو سائیں میراں کے مزار سے بڑی عقیدت تھی۔ مشہور تھا کہ اُن کا انتقال میلوں دور ہوا تھا

اور راتوں رات میت اُڑ کر گاؤں کے میدان میں آن اُتری تھی۔ اُن کے مزار سے کوئی خالی ہاتھ لوٹ کر نہ جاتا تھا۔ چنانچہ عقیدت مند دُور دُور سے مزار پر چادریں چڑھانے آتے تھے۔ روزی روزگار کی دعائیں مانگی جاتیں۔ کنواریاں مزار پر بوسے دیتیں۔ بانجھ عورتیں اپنی چوٹیوں سے دھاگے توڑ توڑ کر مزار کے سرہانے اُگے ہوئے درخت کی ٹہنیوں سے باندھتیں۔ دادُو کو بھی سائیں میراں سے بے حد عقیدت تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ اُس بزرگ کے مزار پر نت نئی چادر چڑھتی تھی اور وہ چادر دادُو رات کے اندھیرے میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگاتا تھا، اُسے چُوم کر آنکھوں پر پھیرتا اور دوسرے دن شہر میں بیچ کر قینچی کے سگریٹ اور جلیبیاں خریدتا تھا۔ آج بھی دادُو جب مزار کی چار دیواری کے پاس پہنچا تو سبز رنگ کی کوری چادر قبر کے چاروں کونوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ سرہانے پھولوں کے ہار رکھے ہوئے تھے۔ عورتیں گڑگڑا گڑگڑا کر دل کی مرادیں مانگ رہی تھیں۔ گلہریاں درختوں کی شاخوں پر اِدھر اُدھر پھُدک رہی تھیں۔ ٹہنیوں سے بندھے ہوئے چوٹیوں کے سیاہ دھاگے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کبوتر بے خوف و خطر آس پاس چُگ رہے تھے۔ ایک سفید بلی آنکھیں بند کیے، قلندرانہ شان سے دیوار کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دادُو نے کان میں اٹکا ہوا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دو چار گہرے کش لیے۔ سامنے سے آتے ہوئے دیہاتیوں سے علیک سلیک کی۔ اور پھر لمبے لمبے قدموں سے چلتا ہُوا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہ سامنے، قبرستان کے اُس پار، اُونچائی پر ایک مکان نظر آرہا تھا۔ وہ مکان ایک لمبے عرصے سے خالی پڑا تھا۔ گاؤں کے باشندے جانتے تھے کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے۔ تاریک راتوں میں وہاں سے وحشت ناک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ دیئے ٹمٹماتی

ہوئی کو بھی اکثر وہاں دیکھی گئی تھی۔ داؤد اُس مکان میں پہنچا۔ چیلے بالکے انتظار کر رہے تھے۔ داؤد کی آمد رعب و داب سے کر آئی۔ مال کی تقسیم میں ذرا دیر نہ لگی۔ کل دو شاگردوں نے ایک گاؤں سے گھوڑی چرائی تھی۔ دوسرے نوجوانوں نے بڑی ہمت اور دلیری سے نقب لگا کر چھوٹے موٹے گہنوں پر ہاتھ مارا تھا۔ یہ سب کچھ شہر میں اونے پونے داموں بیچ کر عقیدت مندوں نے سائیں میراں کے مزار پہ روزی روزگار میں برکت کی دعا مانگی تھی۔

اچانک داؤد کی نگاہ تھوہر میں پھنسے ہوئے خرگوش پر پڑی۔ نرم نرم سفید سی جان کانٹوں سے باہر نکلنے کی جد و جہد کر رہی تھی۔ داؤد تھوہر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ خرگوش نے زخموں سے چھلنی ہو کر، سر اور آدھا دھڑ باہر نکال کر، رحم طلب نگاہوں سے داؤد کی طرف دیکھا۔ داؤد نے خرگوش کو لٹھ سے دھکیل کر پھر تھوہر کے اندر کر دیا اُسے خرگوش کی سفید جلد پر سُرخ لہو کی بڑھتی ہوئی مقدار بڑی دلچسپ معلوم ہوئی۔ اور ایسے تماشے دیکھنے کی عادت اُسے بچپن سے تھی۔ ایک شاگرد نے ترس کھا کر بات کرنی چاہی۔ لیکن مارے خوف کے لب نہ کھل سکے۔ ننھی سی جان تڑپ تڑپ کر ڈھیر ہو گئی۔ داؤد کو ایک عجیب و غریب مسرت کا احساس ہوا۔ سگریٹ سُلگا کر وہ کھیت کی مینڈھ پر چلنے لگا۔ اُس کے پیچھے پیچھے شاگرد ہو لیے۔ چلچلاتی دھوپ میں جوار اور مکئی کے ننھے ننھے پودوں پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ مینڈھ کے کناروں پر گھاس سُوکھ کر پیلی ہو چکی تھی۔ داؤد کے خیالات پلٹ کر بچپن کی طرف چلے گئے، جب وہ ننگے پاؤں کھیتوں میں گھومتا رہتا تھا۔ کبھی غلیل سے کسی پرندے کا نشانہ بناتا۔ کبھی تتلی پکڑ کر ریشم ایسے رنگین پروں کو نوچ لیتا۔ سبز سبز ٹڈوں اور بیر بہوٹیوں کو

ہتھیلیوں سے مل کر کچومر نکال دیتا۔ لیکن بچپن میں وہ سانپ سے بہت ڈرتا تھا جبکہ دوسرے بچّے پانی میں رہنے والے معمولی سانپ کو دُم سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اودھم مچاتے، وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا۔ یہاں تک کہ سانپ اور نیولے کی لڑائی کا قصّہ سُن کر اُس کا جسم تپ جاتا۔ اور اب بھی اگر وہ سانپ دیکھ لیتا تو بظاہر اس کی دلیری میں فرق نہ آتا مگر اندر سے وہ کانپ کانپ جاتا۔

دراصل اُسے تین چیزوں سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ سانپ، چیچک اور بندوق کی گولی۔ اُسے وہ دلدوز واقعہ یاد تھا جب اُس کے بڑے بھائی کو سانپ نے ڈس کر آنکھ جھپکنے میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اپنے بھائی کی لاش کے پاس روتے روتے اس کی گھگّی بندھ گئی تھی۔ چیچک سے وہ اس لیے ڈرتا تھا کہ برسوں پہلے کا گھناؤنا منظر اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ گاؤں میں چیچک کی وبا ایسی پھیلی تھی کہ جنازے اُٹھانے مشکل ہو گئے تھے۔ اُس وبا میں اُس نے اپنے ماں باپ اور بہنوں کے چیچک سے مسخ شدہ چہرے دیکھ کر ایک چیخ ماری تھی۔ اور وہ چیخ آج تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بندوق کی گولی سے تو وہ دلی نفرت کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بندوق بُزدل چلایا کرتے ہیں۔ مردانگی کے جوہر تو لٹھ بازی میں کھُلتے ہیں۔ درخت کی آڑ لے کر کسی کو گولی مارنا اوّل درجے کی بزدلی ہے۔ ایسا واقعہ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب ٹڈیوں کے دَل فصلوں کو تباہ کر رہے تھے۔ گھر کے اندر اور باہر، چھتوں اور درختوں پر، راستوں اور میدانوں میں، تاحدِ نظر ٹڈیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اُس افراتفری کے عالم میں گاؤں کے نمبردار کے بانکے صاحبزادے نے درخت کی آڑ لے کر بندوق کی لبلبی دبائی تھی۔ سنسناتی ہوئی گولی دادو کے بھائی کے سینے کے پار ہو گئی تھی۔ دادو

انتقام کی آگ بجھا چکا تھا۔ اُس نے چُن چُن کر نمبردار کے خاندان کے افراد کا صفایا کیا تھا۔ فرض کی اس ادائیگی میں اس کے شاگردوں نے حسبِ توفیق ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ دو ایک شاگرد پھانسی چڑھ گئے تھے۔ خود کئی مرتبہ قید بامشقت کی سزا پائی تھی۔ بایں ہمہ بندوق کی دھائیں دھائیں کرتی گولیوں کا لرزا دینے والا تصوّر اُس کے ذہن میں جوں کا توں قائم تھا۔

کھیتوں سے نکل کر شاگرد رخصت لے کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ داڈو پٹیل کے چمکتے ہوئے کوکوں والا لٹھ ہاتھ میں تھامے گلی میں داخل ہوا۔ خربوزوں سے لدے ہوئے گدھوں کی قطار آگے آگے جا رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبو سے گلی مہک اُٹھی۔ ٹاٹ کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے خلیفہ نے اُٹھ کر داڈو کو سلام کیا۔ صمد و لوہار نے دھونکنی چھوڑ کر اپنا گرم ہاتھ ماتھے پر رکھا اور جواباً داڈو کا سلام پا کر مسکرانے لگا۔ سامنے سے آتے ہوئے مسجد کے امام نے منہ پھیر کر دوسری طرف کر لیا۔ کرمو درزی، نسوار کی چٹکی منہ میں ڈال کر پٹیل کے چمکتے ہوئے کوکوں والے لٹھ کی طرف دیکھنے لگا۔ کالو چمار کی نگاہیں، داڈو کے سُرخ کھال کے نوکدار جُوتے کا تعاقب کرنے لگیں۔ مودی کی دکان میں بیٹھے ہوئے بڈھوں نے ہولے سے داڈو کو موٹی موٹی گالیاں دے کر ایمان کی سلامتی مانگی۔

داڈو گھر پہنچا تو پھوپھی چوکھٹ کے پاس پیڑھی پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی حسبِ معمول بڑھیا نے لعن طعن کی۔ کوسنے دیئے۔ اُجڑے ہوئے خاندان کی یاد میں دو چار آنسو بہائے اور پھر داڈو کو کھانا دے کر کھانستی ہوئی اندر چلی گئی۔ داڈو چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ ایک آوارہ کُتّا اندر آ دھمکا اور سامنے بیٹھ کر دُم ہلانے لگا۔

داؤو نے مینگ چوس کر ہڈی اس زور سے کُتّے کو ماری کہ وہ بھوں بھوں کرتا ہوا بھاگ گیا۔ داؤو نے کھانا کھانے کے بعد چلم کے کش لیے۔ غنودگی چھانے لگی تو اُٹھ کر کوٹھری میں چلا گیا۔ لٹھ کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ دو چھتی کے نیچے بچھی ہوئی سوتلی سے بنی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ ایک چوہا بل سے نکل کر لکڑی کے صندوق کے پیچھے چھپ گیا۔ گھات میں بیٹھی ہوئی چھپکلی نے ملتانی مٹی سے لپی ہوئی دیوار پر دوڑ کر مچھر کو ہڑپ کرلیا۔ کھونٹی سے لٹکے ہوئے چھینٹوں پڑے ململ کے کُرتے کا گھیرا فرش پر اُوپر تلے رکھی ہوئی منقش گھڑیوں کو چھو رہا تھا۔ کارنس پر ستو سے بھرا مرتبان اور گڑ کی ڈلیوں سے اَٹی ہوئی مٹی کی قاب اور کھڑتالوں کی جوڑی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کھڑتالیں ہاتھ میں لے کر، وہ ململ کا کُرتا پہن کر، تیج تہوار اور میلوں ٹھیلوں میں داؤو غضب کی سمّی کھیلا کرتا تھا۔ دوسری کھونٹی پر سُرخ لنگوٹ ٹنگا ہوا تھا جس کے حاشیے پر دوہرا بخیہ زیب دے رہا تھا۔ وہ لنگوٹ باندھ کر داؤو کبڈی کھیلا کرتا تھا۔ پڑ کوڈی، پڑ کوڈی۔ چوڑے چکلے سینے پھیل کر آہنی دیواریں بن جاتے۔ گردنوں کی رگیں اُبھر آتیں۔ تانبے سے تانبا بج اُٹھتا۔ داؤو نیند میں ڈوب کر خواب دیکھنے لگا۔ پڑ کوڈی، پڑ کوڈی۔ چارپائی پر پڑے ہوئے پہاڑ کا پہلا خرّاٹا سُن کر دہلیز پر بیٹھی ہوئی کالی بلی ڈر کر بھاگ گئی۔

درختوں کے سائے مشرق کی طرف پھیلنے لگے۔ چرواہے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے اپنے تھان پر پہنچ گئے۔ بیل گاڑیاں شہر سے لوٹ آئیں۔ دودھ دوہنے کی آوازیں آنے لگیں۔ عورتوں نے آٹا گوندھ کر تنوریوں میں آگ جلادی۔ لڑکیوں کی آخری ٹولی کنوئیں سے پانی بھر کر واپس آگئی۔

دفعتہً بندوق کی سنسناتی ہوئی گولیاں فضا کو چیر کر قبرستان کی طرف نکل گئیں۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مرغیوں نے اپنے چوزوں کو پروں کے نیچے چھپا لیا۔ سرخ قلغیوں والے مرغوں نے دو ایک بار ککڑوں کک کر کے چپ سادھ لی۔

دوسری مرتبہ گولیاں دھائیں کرتی آسمان کی طرف نکل گئیں۔ سناٹا چھا گیا۔ حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ بچے سہم کر ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ گئے۔ گھروں کے دروازے بند، گلیاں خاموش، گاؤں کو سانپ سونگھ گیا۔

دادو چونک کر اٹھا۔ لٹھ ہاتھ میں لے کر ننگے پاؤں چھت پر چلا گیا۔ سامنے گلی کے سرے پر چار گھوڑے نظر آئے۔ اُن گھوڑوں پر جاٹوں کی ڈھوک کے بپھرے ہوئے جاٹ سوار تھے، اسلحہ سے لیس، باگیں کھینچے، گھوڑوں کی گردنیں تنی ہوئیں، کان کھڑے، سُم اُٹھا اُٹھا کر زمین کا سینہ کوٹ رہے تھے۔

"ہم مریم کو لینے آئے ہیں۔ ہے اِس گاؤں میں کوئی مائی کا لال جو ہمیں روک سکے۔" ایک جاٹ نے بلند آواز میں کہا۔ اور پھر چاروں جاٹوں نے ایڑ لگا کر گھوڑے دوڑا دیئے۔ ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

دادو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی چھت پر سے ہوتا ہوا دوسری چھت پر پہنچا اور پھر وہاں سے تیسری پر، چھتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک صحن میں کود گیا۔ صحنوں کو تقسیم کرنے والی دیواروں کو پھلانگتا ہوا چھوٹی گلی میں پہنچا اور جب دھاڑتے چنگھاڑتے ہوئے جاٹ کچے راستے کا چکر کاٹ کر مریم کے گھر تک پہنچے تو

سامنے، دروازے کے باہر داؤ لٹھ لیے کھڑا تھا اور اس کے قریب مریم کا بوڑھا باپ!

"داؤ ہٹ جا راستے سے۔" ایک جاٹ کی آواز بلند ہو کر گلیوں میں گونجی۔

"داؤ نہیں ہٹ سکتا۔ داؤ نے ہمیشہ راستہ روکا ہے۔" جواباً داؤ نے گرج کر کہا۔

"داؤ کیوں خواہ مخواہ جان دیتے ہو۔"

"داؤ کو جان کی پروا نہیں۔"

"ایک غیر عورت کی خاطر مرنا چاہتے ہو؟"

"مریم غیر نہیں۔ وہ میرے گاؤں کی بیٹی ہے۔"

"تو پھر سینہ تان لو۔ ہم گولی چلائیں گے۔"

"میں جانتا ہوں بزدل ہمیشہ گولی چلایا کرتے ہیں۔"

ٹھائیں، ٹھائیں، دفعتہً گاؤں میں شور مچ گیا۔ داؤ کی آواز نے خوف و ہراس کی دھجیاں اُڑا دیں۔ بوڑھے اور جوان، لٹھ، چھویاں، ٹوکے جو ہاتھ میں آیا لے کر باہر نکل آئے۔ مرمٹنے کے سے انداز میں تیزی سے بڑھتا ہوا ہجوم دیکھ کر چاروں سوار چمپت ہو گئے۔

داؤ، مریم کے گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ راستے کی مٹی پر خون کی دھار تیزی سے بہہ رہی تھی۔ داؤ کا کرتا لہو میں ڈوب کر سرخ ہو گیا تھا۔ مریم کا باپ اپنا صافہ داؤ کے سینے پر رکھے خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بیل گاڑی لے آؤ۔ دادو کو شہر کے ہسپتال میں لے چلو۔" ہجوم میں سے ایک شخص بولا۔

"گھوڑا دوڑا کر ڈاکٹر لے آؤ۔" دوسری آواز آئی۔

"ہم اپنے دادو کو مرنے نہیں دیں گے۔" ایک سفید ریش دیہاتی نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آج دادو نے گاؤں کی لاج رکھ لی۔" جذبات سے لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"مجھے سائیں میراں کے مزار پر لے چلو۔ میں اچھا ہو جاؤں گا۔" دادو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اُس کا سر دیوار سے کھسک کر مریم کے باپ کے زانو پر جا پڑا۔

خُون اور پانی

بھاری بھاری پپوٹے اُوپر کو اُٹھے۔ دونوں آنکھوں کے کونوں کی لکیریں کھنچ کر مدھم پڑ گئیں۔ چہرہ قلبی مسرت کی چغلی کھانے لگا۔ ہتھیلیوں نے بازوؤں کی نمایاں مچھلیوں کو سہلایا۔ پاؤں نے حرکت کی۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، دفعتہً وہ رُک گیا۔ اس نے جیل خانے کی آہنی سلاخوں کو پکڑ کر باہر جھانکا۔ بارہ سال کی تھکن انگڑائی لے کر آزاد دنیا کے خواب دیکھنے لگی۔ وہ دنیا جس میں ایک گلی کے نکڑ پر اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ جس گھر میں اس کی رفیقۂ زندگی، ایک بیٹی اور دو بیٹے رہتے تھے۔ بارہ برس پہلے جس دن عدالت نے اُسے حبسِ دوام کی سزا کا حکم سنایا تھا۔ اُس کی بیٹی شبنم کی عمر ٹھیک دس سال تھی۔ یوسف نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ ظفر میٹھا سال پار کر چکا تھا۔ اُس منحوس دن اُس کی شریکِ زندگی دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔ شبنم کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اُس وقت ظفر نہ معلوم کہاں تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ شطرنج کھیل رہا ہے۔ اور ہر شخص جانتا تھا کہ جب ظفر کی چال لڑ رہی ہو

تو کوئی مرے یا جئے اُس کی بلا سے ۔ اُس دن یوسف نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا تھا ۔ " مجھے ہتھکڑیاں لگا لو ۔ میرے ابّا جی کو چھوڑ دو ۔ وہ بے گناہ ہیں " یوسف کی بھرائی ہوئی آواز سُن کر اُس کے دل میں ایک آواز گونجی تھی " میں بے گناہ نہیں ہوں "

گزشتہ واقعات کی سرخیاں اُبھر اُبھر کر اُس کی آنکھوں کے جھروکوں کے سامنے آنے لگیں ۔ ملازمت کے دوران میں غرض مند اُس کی مٹھی گرم رکھتے تھے ۔ وہ جوڑ توڑ کر کے فائل اُوپر بھجوا دیتا ۔ یہ بالائی آمدنی بھی اس کی اچھی خاصی تنخواہ کو سہارا دے کر اُس کے اخراجات کا ساتھ نہ دے سکی ۔ اس کی اپنی ضروریات محدود تھیں ۔ ہاں ایک سودا تھا جو اس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا ۔ یہ کہ اُس کے بچّے بہترین لباس پہنیں ۔ اچھی تعلیم حاصل کریں ۔ روزانہ ایسی خوراک کھائیں جس میں تمام ضروری حیاتین موجود ہوں ۔ اس مثلّث کا طواف کرتے کرتے اُس کے پاؤں چادر سے اتنے باہر ہو گئے کہ سردی گرمی سے بچنے کے لیے اُس نے ہیرا پھیری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ۔ مرغن غذاؤں کی حدّت سے چہروں پہ بلا کی رونق آ گئی ۔ چھوٹے کندھوں پر بڑے دماغ کلام کرنے لگے ۔ شبنم اور یوسف کی ذہانت ایک روشن مستقبل کی نشان دہی کرنے لگی لیکن مثلث کا ایک کونا روز بروز کمزور ہوتا گیا ۔ اُدھر دیکھتا تو آنکھوں کو چکا چوندی سی آ جاتی ۔ اِدھر دیکھتا تو دل بیٹھ بیٹھ جاتا ۔ اِنتہائی کوششوں کے باوجود ظفر سیدھی راہ سے ہٹ کر اُس پگڈنڈی پر چلنے لگا جو نکمّے اور آوارہ لڑکوں کی چکڑی کی سمت نکل گئی تھی ۔

دفعتہً ایک قیدی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا " امانت میاں کل تم رہا ہو جاؤ گے ۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو سیدھا نواب صاحب کی بیوہ کے پاس

جا کر کہہ دیتا۔ "وہ جرم میں نے نہیں کیا تھا۔"

"اب اس سے کیا فائدہ۔" امانت میاں نے پلٹ کر کہا۔

"سچ کہہ دینے میں ہرج ہی کیا ہے۔"

"جیل میں رہ کر سچ کا نام لیتے ہو؟ سچ کی دنیا تو ان آہنی سلاخوں کے باہر بستی ہے۔"

"وہ دنیا جس میں میرا بھائی رہتا ہے۔" دوسرے قیدی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں اُس دنیا میں میری بیوی، میرا بیٹا یوسف اور میری بیٹی شبنم زندہ ہیں۔ اُن تین انسانوں کو دیکھ کر میں پھر جی اُٹھوں گا۔" امانت میاں بولا۔ اُس کے جھرّیاں پڑے چہرے پر مسرّت کی لہر دَوڑ گئی۔

"لیکن انھوں نے ایک مدّت سے تمھیں دو سطریں بھی نہیں لکھیں۔"

"میرے نزدیک خط و کتابت ایک سطحی بات ہے، میں نصف ملاقات کا قائل نہیں۔ انسان قریب رہ کر بھی دُور ہو سکتا ہے۔ ہم دُور رہ کر بھی ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سُن سکتے ہیں۔ اور پھر ایک عرصہ سے میں نے بھی تو انھیں خط و ط نہیں لکھا۔"

"وہ تمھیں بھول گئے ہوں گے۔"

"چپ رہو۔ میں ایسی بات سننا نہیں چاہتا۔"

بھاری بھاری پپوٹوں نے موٹے موٹے ڈھیلوں کو چھپا لیا۔ آنکھوں کے کونوں کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ امانت میاں نے اپنا چہرہ ٹھنڈی سلاخوں سے لگا کر

کہا۔ "تم نہیں جانتے، دیکھے ہوئے، جانے پہچانے، محسوس کیے ہوئے لمحات زندگی کا اہم جزو بن جاتے ہیں۔ جب جیل کی مغربی دیوار کی پرچھائیں طویل ہو کر مشرق کی طرف پھیل جاتی ہے تو میں جان لیتا ہوں کہ میری بیوی آٹا گوندھ کر باورچی خانہ میں رکھ آئی ہے۔ اب وہ ننگے پاؤں آہستہ آہستہ آنگن کے پکے فرش پر چلتی ہوئی اندھیری کوٹھری سے ایندھن لانے جا رہی ہے۔ فرش کی درزوں کا سیمنٹ کہیں کہیں سے اُکھڑا ہوا ہے۔ دروازے اور کھڑکیوں کا رنگ فیروزی ہے۔ غسل خانے کی طاقچی میں صابن دانی کے پاس ناریل کی چھال دھری ہوئی ہے۔ وہ گھر میرا ہے۔ اس گھر کے داخلی دروازے پر میرے نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔"

"امانت بھیّا" عقب سے ایک آواز آئی اور پھر دو کھردرے، سیاہ اور وزنی ہاتھوں نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُس کے سامنے دو بڑی بڑی، سُرخ، خوفناک آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ آنکھیں فیقو دہاڑی کی تھیں جس نے ایک جُرم پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسرا جرم کیا تھا اور دوسرے جرم کو دفنانے کے ارادے سے تیسرا۔ اس گھناؤنے چکر کی تیز آنچ نے اُس کے شعور کو ٹیڑھے سانچے میں ڈھال کر بیچ چوراہے کے کھڑا کر دیا تھا جہاں سے جیل کا دروازہ بہت قریب پڑتا تھا۔

"یہ لو بھیّا۔ تمھیں کل ریل سے سفر کرنا ہوگا۔" فیقو دہاڑی نے شلوار کے نیفے سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں فیقو۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ شکریہ۔"

جیل کی مغربی دیوار کی پرچھائیں مشرق کی طرف پھیل کر گم ہو گئی۔ الو مونیم کی

پلیٹوں اور مگوں کی کھنکھناہٹ پیٹ کی آگ بجھا کر خاموش ہو گئی۔ چُنگی چوروں کی وساطت سے پہنچی ہوئی چرس اور گانجے کی بدبو نے فضا کو بوجھل بنا دیا۔ موٹے جھوٹے کرتوں پاجاموں سے ڈھکے ہوئے بندے کابکوں میں دبک گئے۔ لیکن ان کے خیالات، قانون کا شکنجہ توڑ، جیل کی چار دیواری پھاند جدھر چاہا نکل گئے۔

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں امانت میاں کا ذہن پلٹ کر ماضی کی اونچ نیچ کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں سے یہاں تک زمان و مکان نے کتنے رنگ بدلے تھے۔ چلچلاتی دھوپ سے بچ کر ٹھنڈی چھاؤں میں سستانے کی خاطر اُس کی زندگی شطرنج کی بساط بن کر رہ گئی تھی۔ وہ آئے دن ایک نئی چال چلتا۔ سوچ بچار کے بعد پیادہ بڑھا کر اگلے گھر میں ٹکا دیتا۔ بچوں کی درسی کتابیں آجاتیں۔ شہ دے کر بادشاہ چت کر دیتا۔ پسندیدہ ڈیزائن کے کپڑے سِل جاتے۔ غبن کی بنیادوں پر ردا رکھ دیتا۔ الماری میں ملٹی وٹامنز کی شیشیاں نظر آنے لگتیں۔ جوڑ توڑ کر کے فائل اوپر بھجوا دیتا۔ ڈیوڑھی میں پھلوں کی ٹوکری پہنچ جاتی۔ گھر کا ہر فرد چاق و چوبند نظر آتا بیگم چوکی پر بیٹھی چھالیا کترتیں۔ کوئی پڑوسن آنگن میں قدم رکھتی تو قدرے تن کر خیر سلا پوچھتیں۔ برادری میں برتاوا ایسا کہ بس دانتوں میں انگلی دبا لو۔ رکھ رکھاؤ میل جول کی قدریں مہاجنی نقطۂ نظر سے تولی جاتیں۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اوپری چمک دمک کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ بھرم کھُلنے لگے۔ ساکھ اپنے چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ ذہنی افراتفری میں وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آیا۔ اور پھر ایک دن واردات کی بھٹی سے نکل کر اُس کے قدم سرخ قالین پر پہنچ کر رُک گئے۔ خان صاحب چادر تانے بڑے صوفے پر سو رہے تھے۔ باوجودیکہ خان صاحب سے

پرانی راہ و رسم تھی اُسے معًا احساس ہوا کہ اُس نے دروازے پر دستک بھی نہیں دی۔ کِس گنوار پنے سے پردہ اٹھا کر اندر جا دھمکا۔ انگاروں پر چھینٹے پڑ گئے۔ خوف طاری ہو گیا۔ اُس نے سوچا "چپ چاپ لوٹ جاؤں۔ لیکن اگر کوئی دیکھ لے تو" وہ قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔

خان صاحب اس کے کھنکھارنے پر بھی بیدار نہ ہوئے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جونہی خان صاحب اُٹھیں گے۔ وہ دل کی بات زبان پر لے آئے گا۔ وہ بغیر کسی جھجک کے کہہ دے گا "مجھے پانسو روپے کی فوری ضرورت ہے" لیکن خانصاحب تو جیسے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ اندر سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسے ہر شے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صرف کلاک کی ٹِک ٹِک سُنائی دے رہی تھی۔ گلدان میں سجے ہوئے پھول خاموشی سے اس کا منہ تک رہے تھے۔ آفتاب کی سنہری شعاعیں پردوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ چابیوں کے گچھے پر پڑی جو اس کے دائیں پاؤں کے قریب قالین کے سُرخ پھول کی پتّیوں پر پڑا جیسے لرز رہا تھا۔ نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ بھٹّی میں شعلے کوندے بھرنے لگے۔ اُس نے جُھک کر چابیوں کا گُچھا اُٹھا لیا۔ قدموں نے خود بخود حرکت کی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں نے سیف کے بیرونی تالے میں چابی گھمائی۔ نگاہوں نے ٹھٹھک کر چاروں طرف دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر شے ساتھ دے رہی ہو۔ اس نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندرونی قفل کھولا، سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹ کر میز پوش میں باندھیں اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ اُس نے پردہ اُٹھا کر باہر جھانکا اور پھر گٹھڑی بغل میں دبائے باہر

نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ جب وہ کوٹھی کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو سامنے سے آتے ہوئے چوکیدار نے سلام کیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ عین اُس وقت ایک کار آ کر رُکی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔ نواب صاحب کی بیگم نیچے اتریں اور کار میں بیٹھی ہوئی دوسری خاتون کو خدا حافظ کہہ کر اندر چلی گئیں۔ اُس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ راستہ طول کھینچ کر ناقابلِ عبور ہو گیا۔ جیسے کسی نے پاؤں میں سیسہ بھر دیا ہو۔ اُس نے سوچا اس وقت اپنے گھر جانا قرینِ مصلحت نہیں۔ چنانچہ ایک تنگ گلی سے گزر کر دوسرے محلّہ میں ایک دوست کے مکان تک پہنچا۔ دستک دی۔ زنانے سے جواب ملا۔ "باہر گئے ہیں۔" دوسرے دوست کے گھر سے بھی ایسا ہی جواب ملا۔ جلدی جلدی اپنے محلّہ کا رُخ کیا۔ اپنے گھر پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ یکایک اتنی دولت کا آ جانا بھی ایک عذاب ہے۔ ابھی اُس نے اپنی سراسیمگی پہ اچھی طرح قابو بھی نہ پایا تھا کہ پولیس نے چھاپہ مار کر رقم برآمد کر لی۔ اُسے حراست میں لے لیا۔ پولیس کی تفتیش شروع ہوئی تو اُسے معلوم ہوا کہ جب وہ سیف میں سے نوٹ نکال رہا تھا تو صوفہ پر خان صاحب کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ قاتل نے اُن کا گلا گھونٹ کر لاش پر چادر ڈال دی تھی اور اب قرائن کے اعتبار سے قتل کا الزام اس پر عائد کیا جا رہا تھا۔

زنداں کی آخری رات وہ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر کے سوچنے لگا کہ اگر یہ دلیل مان نہ لی جاتی کہ قرائن جھوٹ بھی بول دیا کرتے ہیں، اُسے شبہ کا فائدہ نہ دیا جاتا اور وہ کب کا پھانسی لگ گیا ہوتا۔ حبسِ دوام چودہ سال قید جسے اچھے چال چلن کی بنا پر کم کر کے بارہ سال کر دیا گیا تھا۔ اُس نے سوچا۔ کل ایک نیا سورج طلوع ہو گا۔ میں قیدیوں کے کپڑے اُتار کر اپنا لباس پہنوں گا۔ اکیس روپے کی رقم مجھے لوٹا دی جائے گی۔ میں ریل گاڑی

میں بیٹھ کر اپنے شہر جاؤں گا۔"

جیل کے دروازے سے لے کر لکڑی کے چھوٹے پھاٹک تک کوئی ڈیڑھ سو قدم کا فاصلہ تھا۔ دوسرے دن امانت میاں نے وہ فاصلہ اپنے وجود سے ہٹ کر طے کیا۔ اس کا انگ انگ بھرپور انگڑائی لے کر وقت سے آگے نکل جانے کے لیے تڑپ اٹھا۔ اُس نے شدت سے محسوس کیا کہ آہنی سلاخوں کے باہر دنیا بڑی خوبصورت ہے۔ آسمان کی شفاف نیلاہٹ۔ بادلوں کے برف ایسے سفید گالے۔ ہوائیں اڑانیں بھرتے ہوئے کبوتر۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ قیدیوں کی لگائی ہوئی گلاب کی کیاریاں یہاں سے وہاں تک مسکرا رہی تھیں۔ دھوپ میں سکون آمیز مٹھاس رچی ہوئی تھی۔ وہ لمبے لمبے قدموں سے چلتا ہوا لکڑی کے چھوٹے پھاٹک میں سے یوں باہر نکلا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو کہ سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ اور دفعتہً مہربان موجوں کا ریلا اُسے اُٹھا کر کنارے پر پھینک دے۔ سانس کی آمد و رفت جذبۂ اختیار سے مخمور ہو کر تیز تیز ہو ہو گئی۔ کول تار کی سڑک کے قریب پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کے جوڑ جوڑ سے نئے پنکھ پھوٹ رہے ہوں۔ جیسے وہ ابھی اُڑ کر اپنے شہر پہنچ جائے گا۔ جہاں اس کی بچھڑی ہوئی کونج اور پکھیرو آشیانے میں سر جوڑے اُس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

وہ فٹ پاتھ پر جلدی جلدی چلنے لگا۔ اُسے پتہ نہ چل سکا کہ اُس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے جگہ جگہ سے مسک گئے ہیں، پاؤں میں سکڑا ہوا بغیر تسمے کا پرانا جوتا نہایت بدنما معلوم ہو رہا ہے، داڑھی بڑھی ہوئی ہے، سر کے بال الجھے ہوئے ہیں۔ خیالات کے قافلے دوڑ کر اپنے شہر کے میدان میں سے گزر گئے۔ اپنی گلی کے نکڑ پر ایک سکھم آگیا

جہاں زندگی کی رونق نے باہیں پھیلا کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ چلتے چلتے صدیاں گزر گئیں۔ کول تار کی سڑک، عالیشان عمارتیں، شہری زندگی کی چہل پہل، رنگ و بو کی دل کشی، مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ریل گاڑی کا ڈبّہ، تیز دوڑتا ہوا تانگہ، دُلکی چلتے گھوڑے کے ٹاپوں کی کٹ کٹ، تانگے والے کے پیشہ وارانہ آوازے، کوئی منظر، صوت، رنگ، کوئی صورت، چمک دمک اُس کے تصوّر کی وحدت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ لمحہ بہ لمحہ اُس کے خیالوں کے مرکز میں توانائی آتی گئی۔ آشیانہ، کونج اور پکھیرو۔

اپنے شہر کے میدان میں پہنچ کر وہ رُک گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ موسمِ بہار کی ہوا میں گھاس کی پتّیاں ناچ رہی تھیں۔ درختوں کی ہری بھری شاخیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ وقت کا دریا پلٹ کر بہنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں چُل ہونے لگی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک نئی زندگی اُس کے رگ و ریشے میں سرایت کر رہی ہو۔ دو نوجوان سینے تانے اُس کے قریب سے گزر گئے۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ ابھی تک اُسے کسی نے بھی پہچانا نہیں۔ اپنے محلہ میں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ رہگزر وہی تھی۔ لیکن رہرو پہلے نہ تھے۔ دو چار نوجوانوں کے خد و خال میں سے بارہ سال نفی کر کے اُس نے جانی پہچانی معصوم صورتوں کا تصوّر تو کر لیا۔ مگر پھرتیلے قدموں نے بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اپنی گلی کا نکّڑ قریب آیا تو دنیا کی ہر شے پس پردہ چلی گئی۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر اپنے گھر کی دیوار چوم لے۔ فتو پنواڑی کی متجسّس نگاہوں سے بچ کر راہگزر کی مٹی ہتھیلی پر رکھ کر ماتھے سے لگا لے۔ اس نے سوچا پہلے فتو پنواڑی سے بات کر لوں۔ خدا خدا کر کے ایک جانی پہچانی صورت تو نظر آئی۔ اس کا ذہن اس نہج پر سوچتا رہا پر اس کے قدم جذبات کے ریلے میں بہہ کر

اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ دستک دینے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ جہاں کا تہاں رُک گیا۔ دروازے پر کسی غیر نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دفعتہً کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے فتّو پنواڑی کی بوڑھی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔

"امانت میاں!" فتّو نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمھیں دُور ہی سے پہچان لیا تھا۔"

"فتو...... یہ......" امانت میاں اپنے گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ فتّو بات کاٹ کر بولا۔

"کرایہ دار ہیں۔ یوسف کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔ اسے اللہ نے بڑی عزّت دے رکھی ہے۔ اور تمھاری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے۔ اس کا شوہر کسی دُور دیس کا رہنے والا ہے۔ چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسا داماد نہیں مل سکتا۔"

"فتو!" امانت میاں یہ کہہ کر لمحہ بھر کے لیے رُکا اور پھر بولا۔

"اور ظفر؟"

"وہ تو بھیّا اُسی رنگ میں ہے۔ اچھا اب ذرا آؤ۔ بیٹھو تو چائے پی لو۔"

"ابھی نہیں۔ پھر آؤں گا۔ پہلے میں اپنی بٹیا کو دیکھ آؤں۔ کدھر ہے گھر اس کا"

فتو پنواڑی نے پہلے جعفری صاحب کا نام لیا۔ پھر نئی آبادی مکان نمبر سات کا پتہ بتایا۔ امانت میاں کو اپنے داماد کا نام بڑا پیارا معلوم ہوا۔ ایک تازگی سی ایک شگفتگی سی آس پاس پھیل گئی۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے قدموں سے چلتا ہوا نئی آبادی میں

پہنچا۔ اُسے یاد آیا کہ بارہ سال پہلے وہ علاقہ بالکل اُجاڑ تھا۔ لوگ دن کے وقت بھی اُدھر جاتے ڈرتے تھے۔ اب زرد رنگ کے مکان کندھے سے کندھا ملا کر چار فٹ چوڑی پکّی سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ امانت میاں مکان نمبر سات کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ سیاہ تختی پر اُس کے داماد کا نام سفید حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اُس نے تھرتھرے پر کھڑے ہو کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں کے بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"کون ؟"

"میں۔" امانت میاں کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔

"آپ کا نام ؟"

"شبنم ؟"

"جی"

"میں تمھارا ابّا ہوں۔"

وقت کی گود میں پروان چڑھی آواز گو بدل چکی تھی تاہم خون اور دی ہوئی محبّت نے اسے پہچاننے میں گھڑی بھر بھی دیر نہ کی۔

ایک سیاہ آنکھ نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا اور پھر دوسرے لمحہ شبنم اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ خوشی کی اچانک یلغار میں شبنم کے ہونٹ سِل گئے۔ اِدھر بارہ سال کے اَن گنت لمحوں کی زبان فوراً کھلنے سے جھینپ سی گئی۔ آنسوؤں کی ندی نے چُپ چاپ باتیں کرلیں۔ شبنم اپنے ابّا کو ہاتھ سے پکڑ کر دیوان خانے میں لے گئی۔ نعمت خانے سے گلاب جامن اور برفی نکال لائی۔

لپک کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جھٹ اسٹوو جلا کر اوپر کیتلی رکھ دی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے بچے کے جھولے کو جنبش دے گئی ——— امانت میاں نے نہایت اطمینان سے جوتا اتار کر پاؤں کے انگوٹھے چٹخائے۔ دونوں بازو صوفے کی پشت پر پھیلا کر جسم کی رگ رگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سامنے دیوار پر کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔ پانچ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے ——— امانت میاں کی نگاہ سیکنڈوں کی دوڑتی ہوئی سوئی پر سے ہٹ کر آتش دان پر پہنچی جہاں شبنم کے بچپن کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ رو پڑے۔ کھلکھلا کر ہنس دے۔ زور سے "شبّو" کہہ کر پکارے۔ شبّو کو ہاتھ سے پکڑ کر اسکول کے دروازے تک پہنچا آئے۔ مختلف سمتوں میں بہتے ہوئے خیالات یکایک ایک مرکز پر پہنچ کر رک گئے۔ اس لمحہ جذبات کی اکائی نے اُسے احساس دلایا کہ قدرت نے شبنم کو آتشدان پر سے اٹھا کر باورچی خانے میں پہنچانے تک کتنی عجلت سے کام لیا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شبّو نے گھر سے متعلق ابھی تک کوئی بات نہیں کی۔ پھر اس نے سوچا وہ گھر تو اب اس کا میکا ہے۔ جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ شبنم باورچی خانہ میں بیٹھی اسٹوو کے ہلکے نیلے اور سُرخ شعلوں کو دیکھ رہی ہے اور سوچ رہی ہے۔ اُس کے خیالات اور جذبات کے شور و غوغا نے اسٹوو کی شاں شاں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور وہ نہیں جانتی کہ باتوں کے ہجوم میں سے کون سی بات کرے اور کیسے ——— سر سر پانی اُبل چکا تھا۔ شبنم نے چونک کر کیتلی اسٹوو پر سے اتاری۔ چند لمحوں میں چائے میز پر پہنچ گئی۔

"ابا جی، آپ نے مٹھائی کو چھوا بھی نہیں۔"

"شبنم بٹیا پہلے تم مٹھائی کھاؤ۔ یہ لو۔"

باپ نے برفی کا ایک ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ شبنم کی نگاہیں خود بخود نیچی ہوگئیں۔ ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی تین اُنگلیوں سے برفی کا ٹکڑا پکڑ کر پرچ میں رکھ دیا۔ خاموشی کا احساس دور کرنے کے لیے اُس نے خوشنمائی کوزی کو اُتار کر میز پر رکھا اور پھر چائے بنانے لگی۔ گو نگے لمحات پرچ پیالیوں کی کھنکھناہٹ، بھاپ اور خوشبو کا روپ دھار کر بوجھل قدموں سے منزل طے کر گئے۔

"شبو بیٹا!" باپ نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔

"جی!"

"گھر کا حال مجھے فتو پنواڑی نے بتایا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم سب اپنی اپنی جگہ پر سُکھی ہو۔ رہا ظفر۔ وہ منہ میں لگی ہوئی کالکھ نہ جانے کب دُھلے گی۔"

ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ کلاک نے پانچ بجائے۔

دفعتہً شبنم کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ فق ہوگیا۔

"ہائے میرے اللہ" اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کیا بات ہے شبو؟" باپ صوفے پر سے اُٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"اُن کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔" شبنم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں بٹیا میں بھی تو انہی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ابا جی آپ نہیں جانتے۔"

"کیا؟"

"ابا جی۔" شبنم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا

چہرہ چھپا لیا۔

"آخر بات کیا ہے؟"

"وہ نہیں جانتے کہ آپ جیل میں تھے۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ آپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔" شبنم رُک رُک کر بولی۔

اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ شبنم لپک کر جھولے کے پاس گئی اور بچے کو پوتڑے میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔ ننھی سی جان اور اس کے مستقبل کو سینے سے لگا کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس نے جھک کر بچے کو دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ جیسے اب وقت کا کوئی طوفان بھی اس کی گرفت کو ڈھیلا نہ کر سکے گا۔ ماں کی انتہا نے سوچ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اور یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ اس کا باپ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے باہر نکل گیا ہے وہ دیکھ نہ سکی۔ اس کے کان دبی ہوئی محبت کی پکار سن نہ سکے۔ ادرنئی آبادی کے مکان نمبر سات سے باہر نکل کر امانت میاں نے محسوس کیا جیسے وہ تمام علاقہ اُجاڑ ہے اور لوگ دن کے وقت بھی وہاں سے گزرتے ڈرتے ہیں۔ ایک آگ سی، ایک لپکتا ہوا شعلہ سا اُس کے تن بدن کو جھلسنے لگا۔ چار فٹ چوڑی پکی سڑک پر چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ راستہ کتنا اجنبی ہے۔ اس راستے کو چھوڑ کر وہ تارہ کول کی اس بڑی سڑک پر ہو لیا جس کے دو رویہ شیشم کے سایہ دار درخت اُگے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے وہ غیر شعوری طور پر ایک گلی کی سمت ہو لیا۔

"جیو استاد۔" اچانک ایک آواز آئی۔

امانت میاں رُک گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ غنڈوں کی ٹولی نے گلی کے سرے پر شطرنج کی بساط بچھا رکھی تھی۔ بازی ختم ہونے کے بعد بحث و تنقید ہو رہی تھی۔ ٹولی میں سے ایک شخص نے امانت میاں کو دیکھ کر دوسرے کو کہنی ماری۔ پھر تیسرے

نے دیکھا۔ پھر سب نے۔

ٹولی میں سے ایک شخص فوراً کھڑا ہوگیا۔ اُس نے دائیں کان میں سگریٹ اٹکا رکھا تھا۔ قلمیں چُھٹی ہوئیں، گلے میں تعویذ، دو گھوڑے بوسکی کی قمیص میں سونے کے بٹن، انداز برخاست میں شورہ پشتی کی جھلک۔

"کیا بات ہے اُستاد؟" اس شخص سے دوسرے غنڈے نے پوچھا۔

استاد قدم قدم چلتا ہوا امانت میاں کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔

"میرے ابا" استاد نے چیخ کر کہا اور پھر دوڑ کر امانت میاں سے لپٹ گیا۔

"کون؟" امانت میاں نے رُوکھے پن سے دریافت کیا۔

"میں ہوں ظفر۔ آپ کا بیٹا۔"

"نہیں استاد تمھیں غلطی ہوئی ہے۔ میں تمھارا باپ نہیں ہوں۔" امانت میاں نے نچلا ہونٹ اوپر کے دانتوں تلے دبا کر کہا اور پھر ظفر کو سامنے سے ہٹا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

سُورج مکھی

ماں باپ نے تو اُس کا نام لالہ رُخ رکھا تھا لیکن آپا نے پیار ہی میں اُسے سورج مکھی بنا دیا۔ لالہ رُخ کے ابّا کو اس کا پتہ چلا تو ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آپا کو وہ ڈانٹ پلائی کہ توبہ ہی بھلی۔ ادھر بیگم لال پیلی ہو ہو گئیں۔ آپا کو چٹیا سے پکڑ کر نکال باہر کرنے پر تُل بیٹھیں۔ خوب جلی کٹی سُنائیں۔ آپا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری وادی میں ہر خوبصورت بچّی کو پیار سے سورج مکھی پکارا جاتا تھا۔ بے بی کا مکھڑا دیکھ کر میری زبان سے بے اختیار سورج مکھی نکل جاتا ہے۔" آپا نے کچھ ایسی برجستگی، خلوص اور سادگی سے جواز پیش کیا کہ لالہ رُخ کے ابّا موم ہو گئے۔ بیگم کا دل پسیج گیا۔ آپا کی بات اُبھر کر مستقبل کا پیش خیمہ بن گئی۔ وہ بے روک ٹوک بے بی کو پیار کے نام سے پکارنے لگی۔ رفتہ رفتہ اپنے پرائے سب کی زبان پر سورج مکھی کا نام چڑھ گیا۔

کون جانے یہ حسنِ اتفاق تھا یا نئے نام کا صوتی اثر کہ بچوں کی ہاتھ گاڑی سے

لے کر کانونٹ پہنچنے تک لالہ رُخ کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی مانند پیلا نکل آیا۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے نرم و نازک زرد پتّیاں شبنم سے دُھل کر آفتاب کی کرنوں میں چمک رہی ہوں۔ دن برس پلک جھپکنے میں بیت گئے۔ جب سورج مکھی کے جسم اور ذہن نے کچھ وقت، کچھ فاصلہ طے کر دیا تو وہ نیلے اسکرٹ کو چھوڑ کر قمیص شلوار پہننے لگی۔ بالوں میں فیتہ باندھنے کے بجائے ترینے سے دوپٹا اوڑھنے لگی۔ اب وہ اسکپنگ کرتی تو اپنے بدن کی کنواری لرزش کو محسوس کر کے جھینپ جھینپ جاتی۔ قہقہہ لگاتی تو آس پاس کا دھیان رکھتی۔ ہاں ذرا رُک کر سنجیدگی سے سوچ بچار کرنا گنتی حساب کے اعتبار سے ابھی دور کی بات تھی۔ لیکن ایک دن جب ڈرائنگ کی کلاس میں سسٹر انیتھونی نے مثالیں دے کر اُسے رنگوں کی آمیزش سمجھائی تو دفعتہً اس کا شعور تھرتھرا کر وقت سے بہت آگے نکل گیا۔ سسٹر انیتھونی بولی "یہ پیلا رنگ ہے تمھارے چہرے کی طرح۔ یہ نیلا رنگ ہے تمھاری آنکھوں کی مانند۔ اگر یہ دو ابتدائی رنگ ملا دیئے جائیں تو ثانوی رنگ "سبز" بن جاتا ہے۔ اور سبز رنگ سب رنگوں میں افضل ہے۔ یہ فطرت کا اپنا رنگ ہے۔" سورج مکھی سسٹر انیتھونی کے برف ایسے سفید لباس، سیاہ دانوں والی تسبیح اور چھوٹی سی صلیب کی طرف دیکھتے ہوئے گہرے سوچ میں گم ہوگئی۔ پھر اُسی دن تفریح کے وقفے میں اُس کی ایک ہم جماعت نے آواز بدل کر کہا "سورج مکھی یہ جو تمھارے دائیں رخسار پر کالا تل ہے۔ رنگوں کی زبان میں کس بات کی نشان دہی کرتا ہے؟" یہ سُن کر سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بظاہر تو وہ بھی ہنس دی مگر اندر سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

سینئیر کیمبرج کر لینے کے بعد اس نے ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت اختیار کر لی۔

وہاں پہنچنے تک وہ جگہ جگہ رُک رُک کر باتوں کے رنگ اور رنگوں کی باتیں سوچتی رہی۔ اس عرصے میں جب موت نے پہلی مرتبہ اُس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے محسوس کیا جیسے وہ سمٹ کر ایک بے مایہ ذرّہ بن گئی ہو جس کی اس وسیع دنیا میں کوئی وقعت نہ ہو۔ ابّا کے انتقال کے بعد جب امّی اور آپا نے بھی ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا تو اس نے کالی چادر اوڑھ کر اپنی وسعتِ ادراک کو گمبھیر تاریکی کے سپرد کر دیا۔ لمحات کا قافلہ اپنے نقوش چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ دفتر کی وضع دارانہ روا روی میں وقت تیزی سے گزر جاتا۔ لیکن جب وہ لوٹ کر گھر آتی تو در و دیوار کی ویرانی اس کی سوچ کو اپنے شکنجے میں کس کر نڈھال کر دیتی۔ چھٹی کے دن جب وہ تنہائی سے اُکتا جاتی تو بستر پر پڑے پڑے کمرے کی سفید دیواروں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی اور دل ہی دل میں ہزاروں باتیں سوچتی۔ ایک شام جبکہ وہ ایسی ہی ذہنی اور فکری کشمکش میں تھی، اچانک برآمدے میں قدموں کی آہٹ ہوئی۔ پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟"

نیلے رنگ کا پردہ ایک طرف کو سرکا۔ دو چہرے نمودار ہوئے۔ ایک اُس کی ہم جماعت رخشندہ کا اور دوسرا رخشندہ کے بھائی آفتاب کا۔ رخشندہ سرخ ریشمی ساری اور اسی رنگ کے کوٹ میں ملبوس تھی۔ آفتاب نے خاکستری رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوسرے لمحہ رخشندہ کے قہقہوں سے کمرہ گونج اُٹھا۔ ماضی کھنچ کر قریب آگیا۔ رخشندہ کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ پالش کیے ناخنوں والی انگلیاں تاکیدی جملوں کے ساتھ ساتھ ناچنے لگیں۔ رخشندہ سیدھی ریس کورس سے آ رہی تھی ——— حسبِ معمول اس نے ٹرپل ٹوٹ پر داؤں لگائے تھے۔ آج کامیابی نے بڑھ کر قدم

چومے تھے۔ اب ہینڈ بیگ میں رکھے ہوئے نوٹوں نے لہو کی گردش کو تیز کر رکھا تھا۔ پہلے اس نے گھڑ دوڑ کی باتیں دہرائیں پھر لا گورمے کا ذکر چھڑ گیا۔ اس نے آج رات کے فلور شو میں حصّہ لینے والے ہسپانوی فنکاروں کے نام انگلیوں پر گن ڈالے خصوصاً اس رقاصہ کا نام بڑی عقیدت سے لیا۔ جس کا لچکدار بدن ہوا کی لہروں پر تیرتا ہوا دلوں میں ہل چل مچا دیتا تھا۔ جگمگاتی زندگی کا نقشہ کھنچ گیا۔ رخشندہ کی باتوں کی گرمی سورج مکھی کی تھکی تھکی رگوں پر ٹکور کرنے لگی۔ اُس وقت آفتاب کے کھانسنے کی آواز نہ آتی تو شاید سورج مکھی کو فضا میں پھیلتی ہوئی ہلکی ہلکی خنکی کا احساس نہ ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ آفتاب نے کوٹ کا کالر اُوپر کو اُٹھا لیا ہے۔ وہ بید کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی نگاہیں زرد ٹائیلوں کے فرش پر جمی ہوئی ہیں۔ سورج مکھی نے اُٹھ کر کھڑکی کے کواڑ بھیڑ دیئے۔ جونہی وہ لوٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے لگی، رخشندہ نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر کھینچ کر اسے بغلی کمرے میں لے گئی۔ پھر تو رخشندہ نے بات کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ سورج مکھی نے جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ میک اَپ کیا۔ اکھرے بدن پر جارجٹ کی سبز ساری اور اس سے میچ کرتا ہوا پورے بازو کا سویٹر۔ کانوں میں زمرّدیں ٹاپس، کونج کی سی گردن میں موٹے موٹے منکوں کی شفّاف ہریالی، بانکپن اور رعنائی نے جلا پا کر سنگھار میز کے آئینے میں جان ڈال دی۔ لا گورمے پہنچ کر جب سورج مکھی ٹھنڈی اور تازہ بیئر کی ایک بوتل پی چکی تو اُسے ایک عجیب و غریب مسرّت کا احساس ہوا۔ آس پاس کی ہر شے چولا بدل کر خوبصورت بن گئی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے خوشنما معلوم ہونے لگے۔ چاروں طرف بنے سنورے چہرے لپ اسٹک سے آراستہ ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹیں۔ پنسل سے کھنچے ہوئے

ابروؤں کی کمانیں، سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو، آنکھوں میں دوڑتے ہوئے گلابی ڈورے، ڈریس سوٹوں میں کسے ہوئے مردوں کی نپی تلی شائستگی، رنگ برنگ کے لباس زیب تن کیے جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں جنھوں نے اپنے جسموں کے بالائی حصے زیادہ سے زیادہ برہنہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رکھی تھی۔ اِدھر کسی کے جوڑے میں مسکراتا ہوا پھول اُدھر کسی کے ماتھے پر کنڈلی مارے ہوئے زلفوں کی لٹ۔ سوج مکھی کو یوں محسوس ہوا جیسے ماضی ایک سفید جھوٹ ہے اور مستقبل ایک حرفِ باطل۔ دفعتہً نغمۂ ساز کی ایک لہر اٹھی۔ مرد عورتوں کے جوڑے ساز کی سنگت میں لکڑی کے صاف ستھرے فرش پر رقص کرنے لگے۔ پیانو نواز کی انگلیاں کمال پھرتی سے پیانو کے پردوں پر ناچیں۔ کلیرونٹ کی آواز فضا کو چیر کر پیانو کے سُر سے ہمکنار ہوئی۔ اُدھر سمبلز نے سماعت کو چوکس کیا سیکسافون کی آواز تڑپ کر سمفنی کی جان گرما گئی۔ طبل نواز نے شہ دے کر رقص کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ بھرپور زندگی کے ساغر میں طوفان آ گیا۔ پیٹنٹ کے چمکتے ہوئے سیاہ جوتے اور اونچی ایڑی کی سینڈلیں فرش کے سینے پر تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ کسی نے سوج مکھی کے انگ انگ کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مرت کبھی بھی اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا نہیں سکتی۔ اب وہ سمٹ کر بے مایہ ذرّہ نہیں بن سکتی۔ اب اس نے توانائی کا راز پا لیا ہے۔ اب وہ جی سکتی ہے۔ خوش رہ سکتی ہے۔ مسکرا سکتی ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ رخشندہ کتنی اچھی ہے۔ اُس نے تو پہلے بھی کئی بار اسے "فلور شو" کی دعوت دی تھی مگر ہر مرتبہ وہ کسی نہ کسی بہانے کی آڑ لے کر کنی کاٹ جاتی۔ لیکن آج شام جیسے وہ زندگی کے ڈھرّے سے ہٹ کر چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ کسی اچانک تبدیلی کی راہ تک رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے رخشندہ اور آفتاب کے ہمراہ ہولی۔ تاکہ سفید

دیواروں والے کمرے کی اداس تنہائیوں سے نکل کر زندگی کی رونق اور گہما گہمی کو دیکھ سکے، سُن سکے، محسوس کر سکے۔ آرکیسٹرا ایک دلکش ترتیبی انداز میں بھنور بناتا ہوا آہستہ آہستہ ٹوٹتی لہروں کا روپ دھار کر خاموش ہو گیا۔ رقص کرنے والوں کے قدم رُک گئے۔ دیکھنے والوں نے تالیاں بجا بجا کر داد دی۔ جلبل نواز نے جیب میں سے رومال نکال کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ میزوں پر بلوریں جام کھنکنے لگے۔ رخشندہ نے سرخ کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

"سورج مکھی!" رخشندہ بیئر کے دو چار بڑے بڑے گھونٹ اُوپر تلے پینے کے بعد بولی۔

"یس ڈارلنگ" سورج مکھی متوجہ ہوئی۔

"آفتاب پاگل ہے"

سورج مکھی نے غور سے آفتاب کی طرف دیکھا۔ کھلتا ہوا رنگ، گھنگھریالے بال، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ وہ نہایت سلیقے سے بیئر پی رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی پہ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ آفتاب کو وہ پہلے بھی دو چار مرتبہ مل چکی تھی۔ یونہی رسمی طور پہ، سرسری انداز میں۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" ٹھنڈا اور بے جان فقرہ دہراتے ہوئے۔ لیکن اتنا وہ جانتی تھی کہ آفتاب انگریزی کا پروفیسر ہے۔ ایک مرتبہ اُسے رخشندہ نے بتایا تھا کہ آفتاب نے ہیملٹ کا پورا ڈرامہ حفظ کر رکھا ہے۔ اور ایک دفعہ کلاس میں ہیملٹ کی خود کلامی دہراتے ہوئے اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہے تھے۔ الفاظ کے سوز و گداز

میں ڈوب کر وہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک عرصے تک بیمار رہا تھا۔
"سورج مکھی، میں بغیر کسی تمہید کے سارا قصہ چار لفظوں میں سنا دیتی ہوں۔"
رخشندہ نے یہ کہتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اگر میں آج صبح آفتاب کا دیوان نہ دیکھ لیتی تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس نے تمھاری نیلی آنکھوں، زرد چہرے اور رخسار کے کالے تِل پر سینکڑوں اشعار....."

"رخشندہ پلیز!" آفتاب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔" رخشندہ چمکارتے ہوئے بولی۔
آفتاب چپ چاپ بیٹھ گیا۔

سورج مکھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ موتیوں کی لڑی ایسے دانت چمکے۔ نیلی جھیلوں میں چھائے ہوئے نشے کے بادل جھومے۔ ہونٹوں کی سرخ کلیاں کھل کھل گئیں۔
قریب بیٹھے ہوئے افراد گھور گھور کر آفتاب کی طرف دیکھنے لگے۔
یکایک کیبرے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ برقی قمقموں نے آنکھیں میچ لیں۔ موسیقی کی ہم آہنگی میں ایک نیم برہنہ عورت تھرکتی، ناچتی، مسکراہٹوں کے پھول برساتی، بیچ میزوں کے پہنچ کر رک گئی۔ فلڈ لائٹ کی زد میں آکر دو ٹومینس پارچے جو اس کے بدن پر نہایت بے دلی سے ٹکے ہوئے تھے، جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ معاً وہ بجلی کی طرح کوندی۔ سپاٹ لائٹ کی سرخی میں اس کے بدن کے تھرتھراتے ہوئے خطوط نے عجب تندی سے للکارا۔ شراب آلود آنکھوں کی پکار گونجی۔ ہونٹوں کے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں نے آواز دی۔ اور پھر آن کی آن میں اس کے مرمریں بدن نے ہوا میں لہریے بنا کر تماشائیوں کا لہو گرما دیا۔ جذبات کی اس ہلچل میں شریک ہو کر

سورج مکھی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیئے۔ اس سانس لیتے ہوئے اندھیرے میں وہ سوچنے لگی کہ اگر اتفاق سے کسی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو......

وہ رات لاگورُمے کی تمام دلفریبیاں اپنے آنچل میں چھپا کر ماضی کے دھندلکے میں گُم ہو گئی۔ سورج مکھی کو لمحہ بہ لمحہ احساس ہونے لگا جیسے اب وہ اس دنیا میں تنہا نہیں۔ اس کی ذات پر چھائے ہوئے دو ابتدائی رنگ کسی کو شعر کہنے پر اُکسا سکتے ہیں۔ وہ آمد کا سرچشمہ و منبع بن سکتی ہے۔ اُسے مسٹر انیتھونی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان باتوں کی کوکھ سے لاگورُمے کی سنہری لکیریں اُبھر کر حال کی پگڈنڈیوں پر پھیل گئیں۔

دوسرے دن وہ خود زخشندہ کو ملنے چلی گئی۔ آفتاب سے مل کر اور بعد میں زخشندہ کی باتیں سُن کر اس نے آفتاب کے خیال کو باسی روٹی کا ٹکڑا سمجھ کر اُگل دیا۔ وہ سچ مچ پاگل تھا۔ زخشندہ نے اُسے بتایا "وہ تم سے کم اور تمھارے نام سے زیادہ پیار کرتا ہے۔" یہ سُن کر سورج مکھی کی انا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بچھو نے اُس کے رخسار کے کالے تل پر ڈنک مار دیا ہو۔ جیسے ہوا میں اُڑتے ہوئے باز نے غوطہ لگا کر اس کی نیلی آنکھیں نوچ لی ہوں۔ وہ درد سے تلملا اُٹھی۔

اُس شام زخشندہ کے ہمراہ کلب میں اُس نے جی کھول کر وسکی پی۔ سگریٹ کے کش لیے۔ پوکر کی ابجد سیکھی۔ مردوں سے کُھلم کُھلا باتیں کیں۔ زخشندہ نے اُسے بتایا۔ "آج ہمارے گھر میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ خون کے دباؤ کی وجہ سے آفتاب کی بُری حالت ہو گئی تھی۔"

سورج مکھی نے وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر ہمدردی کا ایک رُوکھا جملہ رخشندہ کے منہ پر دے مارا۔

انتڑیوں میں آگ تیزی سے دوڑنے لگی۔ آداب گفتگو بھٹکنے لگے نشست و برخاست کے سلیقوں میں لغزشیں آنے لگیں۔ رخشندہ نے گڈ نائٹ کہہ کر آنکھ ماری اور پھر ہنستے ہوئے ایک ہنس مکھ کی باہوں میں باہیں ڈال کر باہر نکل گئی۔ ایک قبول صورت نوجوان نے سورج مکھی کو لفٹ کی پیش کش کی اور چند لمحوں کے بعد وہ اپنا سر اُس نوجوان کے شانے پر رکھے، کار کی اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک سکون سا، ایک تسکین سی نس نس میں سرایت کرنے لگی۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں اُسے رخشندہ کے سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ جھجک آنکھیں موند کر ایک کونے میں جا بیٹھی۔ اب وہ مردوں سے اس طرح باتیں کرتی جیسے پھل والے سے پوچھ رہی ہو نارنگیاں ترش تو نہیں؟ جب وہ کسی مرد کے اچھے سِلے ہوئے سوٹ کی تعریف کرتی تو اس انداز سے جیسے کسی نئی کتاب کی خوشنما گیٹ اَپ پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہو۔ جب اسے محبت کا جواب محبت سے دینا پڑتا تو اسے ہلکا سا احساس ہوتا جیسے وہ کسی اچھے شعر کی داد دے رہی ہو۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ ماضی کی بہت سی باتوں کو یاد کر کے ہنس پڑتی۔ اُن باتوں میں محبت کا تصوّر بھی شامل تھا۔ اُن دنوں اُس کا خیال تھا کہ راز و نیاز کی باتیں صرف وہاں ہو سکتی ہیں۔ جہاں کوئی دیکھتا ہو نہ سنتا۔ لیکن اب وہ جانتی تھی کہ یہ وارداتیں کسی وقت اور کسی جگہ ہو سکتی ہیں۔ شاپنگ کرتے وقت، آفس میں ڈکٹیشن لیتے ہوئے، اُس وقت جب کوئی اپنے سگریٹ لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگا رہا ہو۔ جب کوئی ڈائننگ ہال

میں ادب سے کھڑا ہو کر بے بازو کی کرسی کو پُشت سے تھام لے اور وہ مسکراتے ہوئے شکریہ کہہ کر بیٹھ جائے۔ جب والز کی دُھن بج رہی ہو اور کوئی نیا چہرہ ناچ کی مسرت حاصل کرنے کیلئے اپنے ہاتھ بڑھا دے اور پھر رقص کرتے کرتے یوں محسوس ہونے لگے جیسے اجنبیت کوئی شے نہیں۔ بیگانگی پرانا قصّہ ہے۔ زندگی گھُل مل جانے میں ہے۔ رنگ و بو کے اس حلقے میں زندگی تیزی سے گردش کرنے لگی۔ سر کے بالوں کو ترشوا کر وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ نسیں کھنچ جاتیں تو وہسکی کی آگ سے آسودگی حاصل کر لیتی۔ وقت رینگنے لگتا تو گھُل مل کر لمحات کو بہاراں کر لیتی۔ اور پھر سچ مچ وہ سورج مکھی کا پھول بن گئی۔ جدھر مرد کی جوانی کا سورج طلوع ہوتے دیکھتی بے اختیار اُدھر منہ موڑ لیتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ محسوس کرنے لگی کہ جب عورت گھر کی چاردیواری سے نکل کر کلب، ریستوران اور ڈانس فلور پر پہنچ جاتی ہے تو ایک فاتح بن جاتی ہے اور پھر اس کے سامنے ہر جُولیس سیزر گھُٹنے ٹیک دیتا ہے۔ لیکن ایک دن زندگی کی اس راہ پر تیزی سے چلتے چلتے اُسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا ہو۔ وہ رُک کر سوچنے لگی کہ جُولیس مات کھا جاتا ہے لیکن پہلی فاتح عورت کو پرے پھینک کر دوسری فاتح عورت کو اپنی مملکت بخش دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا اگر فرم کا مینجر اُسے ملازمت سے برطرف کر کے نئی سیکرٹری نہ رکھ لیتا۔ یہ وہی مینجر تھا جس نے اُسکی آنکھوں کی نیلی جھیلوں سے متاثر ہو کر دو شعر کہہ ڈالے تھے۔ جس نے اس کے چہرے کی زردی اور کالے تل کی دلکشی بیان کرنے میں عجیب و غریب تشبیہات اور استعارے تراش کر اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا تھا۔ سورج مکھی موقوفی کا نوٹس ہاتھ میں تھامے، گردن جھکائے فرم کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئی لیکن دوسرے ہی دن سینہ تان کر ایک

نئی فرم کے زینے سے اوپر چڑھ گئی۔ اور کل کے منیجر کی اچانک بے رُخی کو بھول کر آج کے منیجر کی من موہ لینے والی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اور جب ایک قلیل عرصے کے بعد دوسری فرم کے منیجر نے میکانکی طور پر وہی برتاؤ کیا جو پہلی فرم کے منیجر نے کیا تھا تو اُسے پہلی سی حیرت نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ وہ مرد کو ریاضی کی مشق سمجھ کر ضرب تقسیم کرنے لگی لیکن ایک سنیچر کی شام، اس کے دل کو آناً فاناً تسلیم کرنا پڑا کہ مرد ریاضی کی مشق نہیں، وہ تو سچا موتی ہے جس کی آب سے زندگی نمو پاتی ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنے دل کی امانت سونپ سکتا ہے۔ وہ چند ہی لمحوں میں منگنی کی انگوٹھی پہنا سکتا ہے۔ اختر نے یہ سب کچھ بات کی بات میں سورج مکھی کو دے دیا۔ اور جب وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا تو ایک معصوم بچے کی طرح اپنا سر سورج مکھی کے سینے پر رکھ آنسو بہانے لگا۔ سورج مکھی نے دل کی آواز سُن کر خود کو اختر کے سپرد کر دیا۔ وہ سمجھی کہ سویرا تو اب ہوا ہے۔ لیکن ایک سہ ماہی کے اندر اندر گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ ایک شام، کلب میں اختر سورج مکھی کو پہچان بھی نہ سکا۔ اختر کے ساتھ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی انگلی میں بھی ویسی ہی انگوٹھی تھی جیسی اس نے سورج مکھی کو پہنائی تھی۔ بات چل نکلی تو سورج مکھی کو پتہ چلا کہ ایسی انگوٹھیاں تو وہ کئی لڑکیوں کو پہنا چکا ہے۔ اُسی جذبے کے ساتھ، اسی ڈرامائی انداز میں۔ سورج مکھی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ تیز تیز قدموں سے بار میں پہنچی اور سرخ گدی والے اونچے اسٹول پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ رم کا بڑا پیگ غٹ غٹ پی کر اس نے کانچ کا خالی گلاس سفید پتھر کے ٹھنڈے کاؤنٹر پر رکھا اور بلاؤز کے اندر سے رومال نکال کر ہونٹوں کو خشک کرنے لگی۔ رم کی تیز آنچ نسوں کو آسودگی پہنچا نہ سکی۔ ادھر سے آتی ہوئی ہیلو کی آواز، اُدھر

سے بڑھتا ہوا مسکراہٹوں کا ہدیہ، نہایت بے دردی سے ٹھکرا کر وہ بار سے نکل کر برآمدے میں چلی گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کلب کا ہر ممبر اس کے منہ پر تھوک رہا ہو۔ برآمدے کی سیڑھیوں سے اُتر کر کچھ دیر وہ لان پر ٹہلتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی کلب کے احاطہ سے باہر نکل گئی۔

اُس رات اس کے خیالوں کی آگ کے شعلے لپک لپک کر اُس کے جسم کو چاٹتے رہے۔ اور اس کے گوشت کی سڑاند نے، اس کی قوتِ شامہ کو ادھ موا کر چھوڑا۔

دوسرے دن جب سفید دیواروں والے کمرے کی اُداس تنہائی میں اس کے دل، ضمیر اور دماغ نے جولیس سیزر کے تابوت میں میخیں گاڑ دیں تو اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک تیز چاقو ہاتھ میں لے کر کلب میں چلی جائے اور ہر اس مرد کا سینہ چیر ڈالے جس نے بہروپ بھر کر اسے دھوکہ دیا تھا، جس نے سچ کے پردے میں ہر مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ پھر اُسے آفتاب کا خیال آ گیا۔ جس کی محبّت کوڑھی تھی۔ جس کا پیار مدقوق تھا جو اس کے عشق میں شعر لکھ سکتا تھا لیکن برملا اظہارِ محبت کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ جس نے اس دَوران میں اسے کوئی آدھ درجن خط لکھے تھے۔ اس کے ہر خط کی ہر سطر میں ایک ناقابلِ بیان درد کی لذت تھی۔ سورج مکھی کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے گھومنے لگے۔ آج بھی آفتاب کے آخری خط سے سیاہ حروف ماضی سے اُبھر کر کمرے کی سفید دیواروں پر پھیل پھیل گئے۔ وہ خط پڑھ کر سورج مکھی باسی روٹی کے اُگلے ہوئے ٹکڑے کو پلکوں سے جھاڑ پونچھ کر اپنانے کے لیے بیقرار

ہوگئی تھی۔ اُس دن وہ سرخ ساری پہن کر زخشندہ کے گھر چلی گئی تھی۔ زخشندہ اور گھر کے دیگر افراد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آفتاب اپنی لائبریری میں مطالعہ کر رہا تھا۔ سورج مکھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ آفتاب کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔

"آفتاب!" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پکارا۔

اُس آواز میں صدیوں کا درد چھپا ہوا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو "میں تھک گئی ہوں۔ میں اب فاتح نہیں بننا چاہتی۔ مجھے قید کر لو تاکہ میں عورت بن جاؤں۔ اس گھناؤنی خاموشی کو توڑ ڈالو تاکہ نئی زندگی کے سوتے پھوٹ پڑیں۔"

آفتاب نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی کانپنے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں کتاب میں گڑی تھیں۔ سورج مکھی ایک کربناک خاموشی کو جوں توں جھیل کر بے نیلِ مرام گھر لوٹ آئی تھی۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے سوچا تھا کہ ایسی بیمار محبت سے تو ہرجائیوں کی محبت کہیں اچھی ہے۔ ایسی تاریک روشنی سے تو روشن تاریکی کہیں بہتر ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا کر دم گھونٹ رکھنا اور دنیا سے الگ تھلگ رہ کر چپکے چپکے دل کی بھڑاس کو حروف میں منتقل کرتے رہنا کہاں کی دیانتداری ہے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جولیس ہر رنگ میں جولیس ہے۔ وہ بولے تو بھی اور نہ بولے تو بھی۔ لیکن نہ بولنے والا جولیس بولنے والے جولیس سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ پہلے کی نہ ختم ہونے والی چپ سے دوسرے کی وقتی چہچہاہٹ زندگی کے چند لمحات کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔

آج اِن خیالوں کی رَو میں بہتے ہوئے سورج مکھی نے چاروں طرف دیکھا تو کمرے کی سفید دیواریں نیلی نیلی جھیلوں کو گھورنے لگیں۔ لکڑی کے سنہرے چوکھٹے میں طلوعِ آفتاب کا منظر جھپکی لے کر دھندلا گیا۔ گلدان کے کناروں پر جھکے ہوئے نرگس کے باسی پھول اپنی بے رونق آنکھوں کا ماتم کرنے لگے۔ طشتری میں رکھے ہوئے سُرخ سرخ سیب خبیث سائے بن کر ناچنے لگے۔ پلنگ کی پائنتی چار تہہ دے کر ترتیب سے رکھی ہوئی سبز ساٹن کی رضائی، سرہانے کی جانب اُوپر تلے دھرے ہوئے سرخ ریشمی تکیے، میز پر اوندھی پڑی ہوئی سنہری جلد والی کتاب کے اُبھرواں حروف، سب پرچھائیاں بن کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ ٹن ٹن کانونٹ کی گھنٹی بج اٹھی۔ سسٹر انیجھتونی کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ برف ایسا لباس، سیاہ تسبیح، چھوٹی صلیب۔ وہاں سے یہاں تک بکھری ہوئی زندگی کی کلیاں اور کانٹے۔ ایک جولیس سیزر، دوسرا، تیسرا، بہروپیوں کے چہرے فضا میں تیرنے لگے۔ اس کا دل دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی بے چین انگلیوں نے میز پر سے چاقو اُٹھا لیا۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی اُنگلی نے چاقو کھولا، آبدار پھل سامنے تھا۔ اس کے دانت بھینچ گئے۔ دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ اس نے پھل کی تیز نوک ایک سیب میں گاڑ دی۔ اور یوں کرنے میں سورج مکھی کو ایک عجیب و غریب راحت کا احساس ہوا۔ جیسے اس نے جولیس کے سینے میں خنجر بھونک دیا ہو۔ اور لہو کے گرم گرم قطرے ٹپ ٹپ اس کے پاؤں پر گرے ہوں اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو۔ "میں فاتح ہوں، میں کلیوپیٹرا ہوں، میں الفاظ میں قید نہیں رہ سکتی، میں باغی ہو کر کتاب کے زنداں سے نکل آئی ہوں، میری ایک منزل لاگورمے ہے، میں والٹز کی دُھن پر ناچ سکتی ہوں۔

مجھے ایک جُولیس چھوڑ دے گا تو میں دوسرے جُولیس کی سلطنت پر قبضہ کر لوں گی۔" اُن آوازوں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔حتیٰ کہ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔اس کی ہڈی ہڈی چیخ اُٹھی جیسے لوہے کے ہتوڑے اس کے جوڑ جوڑ پر دھما دھم برس پڑے ہوں۔اس نے اپنا دایاں رخسار میز پر رکھ دیا، دونوں بازو پھیلا دیئے، آنکھیں بند کر لیں۔

دھپ، دھپ، کسی کے قدموں کی آواز آئی۔اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔دفعتاً کمرے کی چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو کر تیزی سے چکر کاٹنے لگیں۔آفتاب اس کے سامنے کھڑا تھا۔آج اُس کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔آج اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ سورج مکھی دو قدم پرے ہٹ کر اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

آفتاب بڑھ کر پلنگ پر چت لیٹ گیا۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب"۔ آفتاب نے آہستہ سے کہا اور پھر سبز ساٹن کی رضائی سے ٹانگیں ڈھانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سورج مکھی نے حقارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔اس کے انگ انگ میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔کانوں کی لوئیں گرم انگارے بن گئیں۔نیلی جھیلوں میں جوالا پھٹ پڑی۔پہلی فرم کے منیجر نے بھی اُسی پلنگ پر یہی الفاظ استعمال کیے تھے۔اختر کی طلب نے بھی اُسی رنگ میں پکارا تھا۔ہر جولیس نے وہی ناٹک کھیلا تھا۔تمام ہیروئیے مختلف سمتوں سے چل کر اُسی مرکز پر پہنچے تھے۔

"سورج مکھی آجاؤ میرے قریب۔"

سورج مکھی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے وہ میدانِ کارزار میں محاذ پر ڈٹ گئی ہو۔ اُس کا سینہ تن گیا۔ اس کے اندر سے آواز آئی "میں لالہ رُخ ہوں۔ سورج مکھی مرگئی ہے۔ میں چابی دیا ہوا کھلونا نہیں ہوں۔"

اس کا دماغ کھول اُٹھا۔ کنپٹیاں پھڑکنے لگیں۔ رخسار تپ گئے۔ رگ رگ سُلگ اُٹھی۔ وہ مجسّم شعلہ بن گئی۔ وہ شعلہ ہر جوبیس کے نقش و نگار کو جلا کر راکھ کرتا ہُوا میز کی طرف لپکا۔ اُس نے بغیر سوچے سمجھے سیب میں سے چاقو نکال کر دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بجلی کی طرح کوند کر اس نے آبدار پھل آفتاب کے سینے میں بھونک دیا۔

سرخ ریشمی تکیہ اور سبز ساٹن کی رضائی سانس لینے لگی۔ کھُلے دروازے میں پڑا نیلا پردہ لرزنے لگا۔ سورج مکھی نے کوئی چیخ نہ سن کر اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹائے۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا۔ سہم کر اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے آبدار پھل برف ایسے گوشت سے نکال کر زرد ٹائیلوں کے فرش پر پھینک دیا۔ اُس نے جھک کر دیکھا۔ پلکوں نے جامد پتلیوں پر سلائے کر رکھے تھے۔ آج آفتاب کے ماتھے پر پسینے کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ اُس کے بے حس ہاتھ پلنگ کی پٹی سے نیچے لٹک رہے تھے۔

لمحات کا قافلہ پلٹ کر ماضی کی طرف رینگنے لگا۔

دو چھٹانک چاول

قدرت اور انسان نے سوناپور کے قصبہ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔
ریلوے لائن کے مشرق میں دھان اور پٹ سن کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کے اردگرد سپاری، ناریل، لیچی، امرود، جامن، آم اور شریفے کے پیڑ اُگے ہوئے ہیں۔ اُن سے پرے نشیبی علاقہ ہے، جہاں تیس چالیس پھوس کی جھونپڑیاں ایک دوسرے سے دُور دُور کھڑی نظر آتی ہیں۔ ان جھونپڑیوں میں نچلے درجہ کے لوگ رہتے ہیں۔ مغرب میں اونچائی پر، مقامی حکّام، بیوپاری اور متوسّط طبقہ کے لوگ آباد ہیں۔ اگست کے مہینہ میں جب خلیج بنگال میں طوفان آتے ہیں تو جنوب سے پانی کی یورش نشیبی علاقہ اور ریلوے لائن عبور کر کے حکّام کے بنگلوں کے برآمدوں تک پہنچ جاتی ہے۔ نشیبی علاقے کے ننگے پنڈے تمازتِ آفتاب اور مون سون کی دھائیں دھائیں کا مقابلہ کرتے کرتے مضبوط چٹانیں بن گئے ہیں۔ لیکن اگست کے مہینہ میں یہ چٹانیں بھی ڈولنے لگتی ہیں۔

جب سونا پور میں حبس سا پیدا ہو جاتا ہے، ہوائیں تھم جاتی ہیں، آسمان سیاہ ہو جاتا ہے، صرف بادل گرجتے ہیں اور بجلی کوندتی ہے، تو یہ چٹائیں گھاس کی پتیوں کی طرح کانپ کانپ جاتی ہیں۔ ان کی گھبرائی ہوئی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ پھر ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ چیلیں آسمان کی بلندیوں سے اتر کر اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک جاتی ہیں۔ چرواہے ریوڑوں کو ہانکتے ہوئے چراگاہوں سے بھاگ آتے ہیں اور پھر اگست کی مہیب ساعت دھواں دھار بارش ساتھ لے کر سونا پور پر نازل ہوتی ہے۔ پھر چند گھنٹوں کے بعد پانی کی یلغار جب سب سے پہلے نشیبی علاقہ پر دھاوا بول دیتی ہے تو جھونپڑوں کے اندر کی کثافت ابھر کر سطح آب پر آجاتی ہے۔ اگست کا مہینہ نشیبی علاقہ کے کئی رازطشت ازبام کر دیتا ہے۔ مغربی علاقہ سے چرائی ہوئی ساڑھیاں، بلاؤز، جمپر، چولیاں اور ان کے ساتھ ساتھ مٹی کے برتن، جلانے کی لکڑیاں اور سینکڑوں چھوٹی چھوٹی چیزیں پانی پر تیرنے لگتی ہیں۔ ادھر مغربی علاقہ میں بیسیوں کشتیاں پانی پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ گوالن ناؤ میں بیٹھی دودھ بیچ رہی ہے۔ ڈاکٹر ناؤ میں بیٹھا مریض دیکھنے جا رہا ہے۔ پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں ناؤ، مدرسے کے صحن میں ناؤ، ایک گھر سے دوسرے گھر تک جانے کے لیے ناؤ۔ پھر آہستہ آہستہ پانی کم ہونے لگتا ہے۔ پھر دھان کی جھکی جھکی بالیاں نظر آتی ہیں، بھرپورے کھیت، پھر چیلیں گھونسلوں سے نکل کر آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑ جاتی ہیں اور مغربی علاقہ والے گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے نشیبی علاقہ کے چوروں، اچکوں اور بھک منگوں کے کمینہ پن پر رائے زنی کرتے ہیں اور ننگے بنڈے سر جھکائے اپنی جھونپڑیوں کی مرمت کرتے ہیں۔ بھیگے ہوئے کچے فرش پر کیلے اور کھجور کے پتے بچھاتے ہیں اور خالی جھونپڑیوں

ہیں خالی پیٹ رہ کر پانی میں بہہ گئی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو یاد کر کر کے کُڑھتے ہیں۔

آج بھی آسمان پر وہی مہیب سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔

چرواہے کی بانسری سے نکلے ہوئے مدھ بھرے نغمہ کو ہوا کا ایک تیز جھونکا چھین کر شمال کی طرف اُڑ گیا۔ چرواہے کے ہاتھ آپ سے آپ لاٹھی پر جا ٹکے اور دوسرے لمحے وہ ریوڑ ہانکتا ہوا آبادی کی طرف نکل گیا۔

مہیب ساعت قریب آ رہی ہے۔

بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی کوند رہی ہے۔ تا حدِ نظر پھیلی ہوئی ہریالی گہری سبز ہو چکی ہے۔

"اب کیا ہوگا؟" بوڑھی مانگو نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سونٹا ہے۔ اس کا بایاں ہاتھ سپید ابروؤں کو چھوتا ہوا آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ وہ متجسس نگاہوں سے سیاہ بادلوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ کی پشت پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی ہیں۔ اس کے چہرے کی جھریاں ایسی معلوم ہو رہی ہیں، جیسے تالاب کا پانی خشک ہو جانے پر تہ کی چکنی مٹی چلچلاتی دھوپ کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے، ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک، یہاں وہاں، ہر طرف، خلط ملط، لکیریں ہی لکیریں۔ مانگو کی زندگی کا تالاب بھی کبھی سنہرے پانی سے لبریز تھا۔ سنہرا اس لیے نہیں کہ اس نے محلوں میں زندگی بسر کی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اس وقت اس کا خاوند زندہ تھا۔ وہ کھرپے سے گھاس کاٹا کرتی تھی اور اس کا خاوند ہل چلایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی جھونپڑی میں رہتی تھی۔ جس کے سامنے وہ اب کھڑی ہے وہ سبز مرچ اور بھات کھا کر بھی کتنی خوش رہتی تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی راجو اُس وقت

بھی رس گلے کے لیے ترسا کرتی تھی۔ پر کتنے اچھے دن تھے وہ! کالی کلوٹی، پتلی دُبلی معصوم راجو! اپنے آبا کی چھاتی پر بیٹھ کر پریوں کی کہانیاں سُنا کرتی تھی۔ وہی راجو اب جوان ہو چکی ہے اور اس وقت صرف ایک میلی کچیلی ساڑھی پہنے اپنی بوڑھی ماں سے ایک قدم پرے زمین پر بیٹھی ایڑی پر جمی ہوئی مٹی ناخنوں سے کھُرچ رہی ہے۔ اس کی پنڈلیاں اور بازو ننگے ہیں۔ اس کی بغلوں سے جھانکتے ہوئے بال اس کے بدن کی طرح سیاہ ہیں اور اس کی جلد اُس کی آنکھوں کی طرح روشن اور چمکیلی۔

"اب کیا ہو گا؟" بوڑھی مانگو نے پھر اس فقرے کو اس طرح دہرایا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

"اب طوفان آئے گا" ایک آواز آئی۔ پھر قریب سے جھاڑی کے پتّوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر بنیا دیوتا بوڑھی مانگو کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کنکھیوں سے راجو کی طرف دیکھا اور پھر معنی خیز لہجے میں اپنے جُملے کو دُہرایا۔

"اب طوفان آئے گا؟" اس مرتبہ لفظ طوفان کو اس نے ذرا کھینچ کر کہا اور پھر اپنے گلے میں لٹکتی ہوئی طلائی زنجیر کو دائیں ہاتھ کی درمیانی اُنگلی کے اردگرد لپیٹتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

بوڑھی مانگو نے جیسے سُنا ہی نہیں اور راجو دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے زمین پر لکیریں کھینچتی رہی، یونہی ٹیڑھی میڑھی، بے ربط، بے معنی لکیریں۔ جنوب سے

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور راجو کے بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر بکھر گئی اور اس کی ساڑھی پھڑپھڑا کر اس کے شباب کے خم و پیچ کو عریاں کرنے لگی۔ وہ سمٹ کر جھکی جھکی نظروں سے نئے دیوتا کے پاؤں کو تکنے لگی۔ کھڑاؤں میں صاف ستھرے پاؤں اور ان کے اوپر سرخ اور پیلی دھاریوں والی ریشمی لنگی۔ راجو کا جی چاہا کہ وہ نشانہ باندھ کر اس زور سے ڈاؤ* ان پاؤں پر مار دے کہ وہ دوستون کٹ کر دھڑام سے جھاڑی میں جا گریں۔

نئے دیوتا کی ٹانگیں دو ستون ہی تو تھیں جن پر وہ سانس لیتی ہوئی عمارت کھڑی تھی۔ پرانی عمارت چند مہینے پہلے حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ڈھے چکی تھی۔ پرانا دیوتا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ نئے دیوتا نے لے لی ہے۔ صرف صورتوں میں فرق تھا۔ اصول دونوں کے وہی تھے۔ تو اس نگری کا پرانا ساہوکار مر چکا تھا جو نشیبی علاقہ میں روپیہ سود پر دیا کرتا تھا اور اس کے بدلے زمینیں، بیل، گائیں، بکریاں اور پھر معصوم مسکراہٹوں کی رونق، کھلی اور ادھ کھلی کلیوں کی تازگی، نرمی اور چمک وصول کیا کرتا تھا۔ نیا دیوتا تو پرانے دیوتا کے دقتوں ہی سے بوڑھی مانگو پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ وہ براہ راست پنچھی کو پکڑنے کے خلاف تھا۔ بوڑھی مانگو مان گئی تو پنچھی خود بخود کھنچا چلا آئے گا۔ وہ ایک پختہ کار گلچیں تھا۔ چن چن کر کلیاں توڑتا اور پھر ان کلیوں کی نرم نرم پتیوں کا رس چوس چوس کر انھیں مسل کر سونا پور کے راستوں پر پھینک دیتا۔ بوڑھی مانگو کو رام کرنے کے لیے اس نے سینکڑوں حربے استعمال کیے۔ وہ دانے

---

* ایک مخصوص قسم کا چھرا جس سے بنگال میں مچھلی اور سبزی وغیرہ کاٹی جاتی ہے۔

بکھیر کر شکار کی تاک میں چھپ کر بیٹھ رہتا۔ پنچھی کب تک آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرے گا۔ اسے بھوک لگے گی تو وہ خود بخود زمین پر اُتر آئے گا۔ پنچھی صرف ایک دانے کو چونچ سے چھو دے۔ پھر روپے کی کھنک، رنگ برنگی ساڑھیوں کی جھلک اور چاول کی بھینی بھینی خوشبو اسے کھینچ لائے گی اور صیاد کے قدموں میں ڈال دے گی۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ پنچھی بھوکا رہ کر بھی آسمان کی بلندیوں میں اُڑتا رہا۔ اس نے ہر بار چاندی کے کالے دل پر تھوک دیا۔ ہر مرتبہ بوڑھی مانگو کا سونٹا اس تیزی سے بلند ہوا کہ نئے دیوتا کو سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔

"ہاں طوفان آئے گا" بوڑھی مانگو نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر یکلخت گرج کر بولی "اور پھر تم دیکھو گے کہ میں تمہارا کلیجہ نوچ نوچ کر چبا ڈالوں گی"۔ سونٹا بلند ہوا اور نیا دیوتا جس تیزی سے نمودار ہوا تھا اسی تیزی سے غائب ہو گیا۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔

"بیٹا! چاول ختم ہو گئے؟" بوڑھی مانگو نے شاید دسویں مرتبہ پوچھا۔

"چاول تھے ہی کہاں!" راجو نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی جنوب سے شمال کی طرف نکل گئیں میلوں تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیت لہرانے لگے۔ پرندوں نے قلابازیاں کھا کر اُڑان کے رُخ بدل دیئے۔ پکے پکے آم، اُودی اُودی جامنیں اور پیلے پیلے امرود پٹ پٹ مخملیں دوب پر گرنے لگے اور پھر خلیج بنگال کے سینے سے بے پناہ شور بلند ہو کر سونا پور میں گونجنے لگا۔

"اچھا تو میں چھوٹے منصف کے ہاں جاتی ہوں۔ شاید وہاں سے کچھ چاول

مل جائیں۔" بوڑھی مانگو یہ کہہ کر سونٹا ٹیکتی ہوئی ریلوے لائن کی طرف نکل گئی۔

راجو جھونپڑی کے اندر جا کر چٹائی پر بیٹھ گئی۔ جھونپڑی میں دو پرانی چٹائیاں بچھی تھیں۔ جن پر دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔ تکیوں کا بیچ کا حصہ چکناہٹ اور میل کی وجہ سے سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ تکیوں کے کونوں سے پرانے توشے کے گالے باہر نکل رہے تھے۔ ایک پتھر پر پیتل کا دیا رکھا تھا۔ چولھے کے پاس ایک ہانڈی، ایک گھڑا، دو رکابیاں اور ایک پیالہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ جس کے پہلو میں ڈاؤ نظر آرہا تھا۔ اسی ڈاؤ سے سبزی اور مچھلی کاٹی جاتی تھی۔ صندوق کا پینداسیلا ہوا تھا۔

راجو نے صندوق کھولا، ایک ٹوٹا ہوا آئینہ نکالا اور پھر اسے ہاتھ میں تھام کر بازو پورا پھیلا دیا۔ چپٹی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ اور چمکیلی، موٹے موٹے ہونٹ اور پیلے پیلے دانت۔

"جھوٹ۔" اس نے اپنے سامنے کے دانتوں کی بڑی بڑی ریخوں پر نظر س جما کر اپنے آپ سے کہا۔ "مانگو! تو کہا کرتی تھی کہ جس کے دانتوں کی ریخیں اتنی بڑی بڑی ہوں، وہ بڑی خوش قسمت ہوتی ہے۔" وہ سوچنے لگی: "گوری کے دانتوں میں ایک ریخ بھی نہیں۔ قد مجھ سے بھی چھوٹا پر کیسی ٹھسے کی ساڑھیاں پہنتی ہے۔ اس کا بھی تو کمانے والا کوئی نہیں۔ ہاں بدنام ضرور ہے۔ مگر ہمیں کون اچھا کہتا ہوگا۔"

"یہ بھی جھوٹ۔" اس نے اپنے کنوارے ہونٹوں کی طرف تکتے ہوئے سوچا۔

"وہ بھی جھوٹ۔" اس نے گوری کی ساڑھیوں کا خیال کرتے ہوئے دل میں کہا اور پھر وہ زقند بھر کر زندگی کے ایک انجانے دوراہے پر کھڑی ہو گئی۔

ایک طرف مچھلی، بھات، ساڑھیاں، اور بدنامی بھی اور دوسری طرف فاقے اور برہنگی۔ دیکھی" اس نے آئینہ صندوق میں رکھ دیا اور پھر انگلیاں چٹخاتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

ہوا کی سائیں سائیں یکبارگی رُک گئی۔ فضا میں حبس سا پیدا ہو گیا۔ شریفے کے پیڑ سے بُلبلیں پھُر سے اُڑ گئیں۔ چیلوں نے اپنے پروں کی حرکت روک کر غوطے لگا دیئے۔

"اوئی ماں!" راجو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

آسمان پر پھیلی ہوئی سیاہی سمٹ کر دھواں دھار بارش کی صورت میں پھٹ پڑی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ خلیج بنگال کا شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ جھونپڑیوں کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ راجو نے اُٹھ کر آنکھیں جھونپڑی کی جھری پر رکھ دیں۔ کچا راستہ ریلوے لائن سے گزر کر پکی سڑک سے مل گیا تھا۔ سڑک کے خاتمہ پر اسٹیشن ماسٹر کا بنگلہ تھا۔ پکی سڑک اور کچے راستے کے سنگم پر پوسٹ ماسٹر کا خوبصورت بنگلہ نظر آ رہا تھا۔ جس کے سامنے کشادہ برآمدے میں پھولوں کے گملوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

راجو اپنے آپ کو کوسنے لگی "مانگو کو جانے ہی کیوں دیا۔ پرسوں شام کو بھات نصیب ہوا تھا۔ کل دن بھر کچھ نہ ملا۔ ایک دن اور فاقہ سہی۔ پر ایسے سمے مانگو کو جانے ہی کیوں دیا۔"

ایکا ایکی بادلوں کی مسلسل گرج اور بجلی کے کوندے دل دہلانے لگے۔ جنوب سے آہستہ آہستہ پانی کھیتوں سے گزر کر جھونپڑیوں کی سمت بڑھنے لگا۔ دھان

اور پٹ سن کے پودوں کی اُونچائی لمحہ بہ لمحہ کم ہونے لگی۔ درختوں کے تنے ڈوب گئے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پانی کے بہاؤ کے ساتھ ندی نالوں سے نکل کر کھیتوں میں تیرنے لگیں۔ پانی کے پہلے ریلے نے راجو کے پاؤں کو چھوا اور پھر دونوں چٹائیاں تیرنے لگیں۔ کچے راستے پر مردوں، عورتوں اور بچوں کا جمگھٹا لگ گیا تھا۔ راجو نے دونوں تکیے اُٹھا کر صندوق پر رکھ دیئے اور پھر پھسلن سے بچ بچ کر قدم رکھتی ہوئی کچے راستے پر جمگھٹے میں جا ملی۔ اور پھر وہ نچلے طبقے کا قافلہ ریلوے لائن عبور کر کے اونچائی کی طرف بڑھنے لگا۔ ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے ہوئے بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ نیم عُریاں پنڈوں پر بارش دھنا دھن بج رہی تھی۔ بیسریاں لگی ساڑھیاں بھیگ کر جسموں سے چپک گئی تھیں۔ کچے راستے اور پکی سڑک کے سنگم پر پہنچ کر یہ قافلہ دو حِصّوں میں بٹ گیا۔ ایک حصّے نے پوسٹ ماسٹر کے برآمدے میں پناہ لی اور دوسرے نے اسٹیشن ماسٹر کے برآمدے میں۔ اُونچے طبقے کے افراد اپنے بنگلوں میں آرام کرسیوں پر بیٹھے نسائیت کے واضح خطوط دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ قہوہ خانے میں نشیبی علاقہ کی بھرادر جوانیوں کے تذکرے ہو رہے تھے۔ نیا دیوتا حقہ گڑگڑاتے ہوئے ٹکٹکی باندھ کر پنچھی کو دیکھ رہا تھا۔ پنچھی بھیگ کر نکھر گیا تھا۔ شباب کے پیچ و خم نمایاں ہو گئے تھے۔ کلی دُھل کر چمک گئی تھی، اور اُدھر نشیبی علاقہ میں مٹی کے برتن، جلانے کی لکڑیاں، چیتھڑے چھاج، پٹاریاں، چرائی ہوئی ساڑھیاں، بلاؤز، جمپر، چولیاں اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں تیرتی ہوئی جھونپڑیوں سے باہر نکل رہی تھیں۔

"راجو!" عقب سے آواز آئی اور پھر بوڑھی مانگو نے اپنا بھیگا ہوا ہاتھ

راجو کے شانے پر رکھ دیا۔ بوڑھی مانگو کے چہرے کی لکیروں پر بارش کی بوندیں لرز رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر اُن بوندوں میں مل گئے۔

اسٹیشن ماسٹر کی بیگم کھڑکی میں کھڑی اپنے بچّے کو اُونی موزے پہنا رہی تھی اور اس کی گھڑی گھڑی بکھر جانے والی زلفوں کو اسٹیشن ماسٹر اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے درست کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

خدا خدا کرکے بارش تھمی۔ مطلع صاف ہو گیا۔ قوسِ قزح نکل آئی۔ پانی تیزی سے جنوب کی طرف لوٹنے لگا۔ پٹ سن اور دھان کے پودوں کی اُونچائی لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی۔ درختوں کے تنے اُبھر آئے۔ کھیتوں کی مینڈھوں پر اُگی ہوئی گھاس دُھل کر دعوتِ نظارہ دینے لگی۔ پرندے گھونسلوں سے نکل کر ہوا میں اُڑانیں بھرنے لگے۔ قافلے میں حرکت آئی۔ ریلوے لائن عبور کر کے بوڑھی مانگو اور راجو سر جھکائے اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئیں اور پھر چُپ چاپ لکڑی کے صندوق پر بیٹھ گئیں۔

رات ہو گئی۔

چٹائیاں، ٹین کا ڈبا اور مٹی کے برتن پانی کی نذر ہو چکے تھے۔ آگ جلانے اور روشنی کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ خنکی کے ساتھ ساتھ بھوک کی شدّت بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی جھونپڑی سے بچے کا کُھنکھنانا سنائی دیتا۔ پھر تھپکیوں کی آوازیں آتیں اور پھر بچہ تیزی سے روتا روتا آپ ہی خاموش ہو جاتا۔ کہیں قریب سے اُلّو بول اُٹھتا اور جگنو جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے بوڑھی مانگو اور راجو

کے سر کے بالوں کو چھُو چھُو کر اُڑتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل جاتے۔

جب سورج طلوع ہوا تو نئے دیوتا نے دیکھا کہ راجو اپنا سر ماں کی گود میں رکھے ہوئے ہے اور بوڑھی مانگو کا ماتھا راجو کے سیاہ اور چمکیلے شانوں پر ٹکا ہوا ہے۔ دونوں کے بازو صندوق سے نیچے لٹک رہے ہیں اور وہ بے خبر پڑی سو رہی ہیں۔ نئے دیوتا کی کھنکار سن کر پہلے بوڑھی مانگو نے پھر راجو نے آنکھیں کھولیں اور نیا دیوتا بتّیسی نکالے جھاڑی کے پیچھے گم ہو گیا۔

ماں بیٹی کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ راجو کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے سائے گہرے ہو رہے تھے پیٹ میں بھوک کی آگ سُلگ رہی تھی اور اس آگ کی چنگاریاں اُڑ اُڑ کر رگ رگ سے زندگی کی حرکت چھین چھین کر زائل کر رہی تھیں۔ بوڑھی مانگو کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن دنیا کی ہر شے سے ہٹ کر چاول مہیّا کرنے کے خیال پر مرکوز تھا۔ اس کے خیالات ہر جانی بوجھی پگڈنڈی کو کریدنے لگے۔ چھوٹا موٹا گہنا بیچ کر چاول خریدا جا سکتا تھا، اور وہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ بھیک مانگ سکتی تھی مگر آج تو کوئی بھیک نہ دے گا۔ وہ جانتی تھی طغیانی کی وجہ سے چاول کا بھاؤ تیز ہو جائے گا۔ لوگ پرانے کپڑے لتّے دان کر دیں گے، دال، ساگ اور مچھلی کی بھیک دیدیں گے۔ مگر کوئی بھی سُگھڑ عورت مٹھی بھر چاول اس کی جھولی میں نہ ڈالے گی۔ اور اسے چاول ہی کی ضرورت تھی۔ وہی اس کے پیٹ کا ایندھن تھا جس کی آنچ پر اس کی زندگی حرکت کر رہی تھی۔ اور اب وہ آنچ لمحہ بہ لمحہ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اسے بڑے منصف صاحب کا خیال آ گیا۔ وہ بڑے رحم دل تھے۔

"راجو! میں بڑے منصف صاحب کے ہاں جاتی ہوں۔ شاید وہاں سے کچھ مل جائے۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور سونٹا ٹیکتی ہوئی جھکی جھکی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

راجو اُٹھ کر جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ ایک گلہری پیڑ کی ایک ٹہنی سے پھُدک کر دوسری ٹہنی پر چلی گئی۔ ایک بچھڑا کلیلیں بھرتا ہوا ریلوے لائن کی طرف نکل گیا۔ دو گٹاریں مخملیں دُوب پر سے اُڑ کر کٹھل کے پیڑ پر جا بیٹھیں۔ فطرت حرکت کر رہی تھی۔ اناج کی بخشی ہوئی زندگی رواں دواں تھی اور اس کے پیٹ میں حرارت قائم رکھنے والی آنچ دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ "یہ ہریالی اور شادابی کتنی اُداس ہے۔" اُس کا جی چاہا کہ وہ چپ چاپ جھونپڑی کے ٹھنڈے فرش پر لیٹ جائے، اپنے ہاتھ پاؤں، اپنے انگ انگ کے بوجھ کو زمین پر پھینک دے، کوئی حرکت نہ کرے، کوئی بات نہ سوچے، گوری کی ساڑھیوں کا خیال جھٹک کر پرے پھینک دے۔ بس یونہی خاموش پڑی رہے۔ جھونپڑی کے اندر جا کر اس نے سچ مچ اپنے بوجھ کو ٹھنڈے فرش پر پھینک دیا۔ زمین کی نمی آہستہ آہستہ اس کے مساموں میں سرایت کرنے لگی۔ جیسے وہ سو رہی ہو اور جاگ رہی ہو اور سوچ رہی ہو اور بھول رہی ہو، جیسے وہ چاول کے دانے دانے کو ترس رہی ہو، بھوک ایک ختم نہ ہونے والی پکار بن کر وادیوں میں دُور دُور تک گونج رہی ہو، اور اس کا باپ اسے پریوں کی کہانیاں سُنا رہا ہو اور بوڑھی ماں بڑے منصف کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہو، اور نئے دیوتا کی کھڑاویں کھٹ پٹ کرتی پکی سڑک کی جانب جا رہی ہوں اور وہ سڑک

اُدھر جاتی ہو جہاں چاول کے انبار تھے، نمک کی بہتات تھی، ساڑھیاں اور چولیاں تھیں، روپے اور گہنے تھے۔ بھوک کی وحشت سونا پور کے کھیتوں، پگڈنڈیوں اور کچے راستوں پر پھیل گئی اور اس گھناؤنے پھیلاؤ میں راجو کا ذہن چاندی اور سونے کے جالے بُننے لگا۔ اور ان جالوں میں وہ ایک بھوکی مکھی کی طرح پھنس کر ماضی حال اور مستقبل کی شاہراہوں پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ بوڑھی مانگو سونٹا ٹیکتی ہوئی ریلوے لائن کے اُس پار گئی اور خالی ہاتھ لوٹ آئی۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔

لمحات، ختم نہ ہونے والے لمحات، تھکن، ماندگی، پیٹ میں سُلگتی ہوئی آگ، روئیں روئیں میں گُھٹتی ہوئی توانائی، خزاں رسیدہ پیڑ کے پتّے لمحہ بہ لمحہ جھڑنے لگے کِھلی ہوئی کلی کے شباب کا رس، ساعت بہ ساعت بھاپ بن کر اُڑنے لگا۔ اور دو دن کے اندر اندر چاول کا بھاؤ اس قدر چڑھ گیا کہ بھوک کا دیو جھونپڑیوں کو روندتا ہوا متوسّط طبقے کو بھی جھنجھوڑنے لگا۔ دھان کی فصلیں سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو چکی تھیں۔ غلّے کے انبار آناً فاناً منڈیوں سے غائب ہو گئے۔ مہاجنوں نے اس موقع سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کی ٹھان لی۔ اب اگر چونّی کا روپیہ بن رہا تھا۔ تو چند دن کے بعد چونّی کے چار روپے بننے کی امّید تھی۔ نمک کا بھی کال پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ بنگلوں کے در و دیوار بھی لرزنے لگے۔ بھوک، فاقے، پتھرائی ہوئی آنکھیں، پیٹ کے ایندھن کی نفسی نفسی تلاش نے انسانیت کی مقدس روایات کو تہس نہس کر دیا۔ چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر دھڑام دھڑام گرنے لگیں۔

دودھ بھری چھاتیاں خشک ہو گئیں۔ ننھے منّے بچّوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ایک سوالیہ نشان بن کر نیلے آکاش کی طرف تکنے لگیں۔

بوڑھی مانگو دو دن تک سونٹا ٹیکتی ہوئی ریلوے لائن کے اُس پار جاتی رہی۔ اس نے بڑے منصف کا دروازہ بار بار کھٹکھٹایا۔ اِدھر اُدھر آنچل پھیلا پھیلا کر بھیک مانگی۔ ہر جگہ دستِ سوال دراز کیا۔ مگر ہر بار بھُوک کا جواب بھُوک سے ملا۔ آخر تھک ہار کر وہ بھی راجو کی طرح جھونپڑی کے ٹھنڈے فرش پر لیٹ گئی۔ "یہ تاریکی کبھی ختم نہ ہو گی۔ یہاں اُمید کی کوئی کرن نہیں پھُوٹ سکتی۔" بوڑھی مانگو کے دل نے پکار پکار کر کہا اور پھر وہ غلط ملط لکیروں، سپید بالوں اور لرزتے ہوئے ہاتھ پاؤں کا ایک خاموش ڈھیر بن کر آنے والی گھڑیوں کا انتظار کرنے لگی۔

"مانگو! اب تو بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔" راجو نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

کہیں پڑوس سے بین سُنائی دیئے اور پھر کوئی عورت دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھڑاؤں کی آواز آئی اور پھر نئے دیوتا کی سرخ اور پیلی دھاریوں والی ریشمی لنگی کا کونا نظر آیا۔ حیرت انگیز طور پر بوڑھی مانگو میں قوّت عود کر آئی۔ جیسے کسی نے اس کے بدن پر لوہے کی تپتی ہوئی سلاخ رکھ دی ہو۔ وہ بھُوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی سونٹا ہاتھ میں لے کر جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ نیا دیوتا تو حسبِ معمول چمپت ہو گیا۔ مگر بوڑھی مانگو واہی تباہی بکتی رہی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اس نے پرُانے دیوتا کا نام لے کر تھوک دیا۔ پرُانے دیوتا کے دادا اور پردادا

پر کھلم کھلا لعنت بھیجی۔ ساہوکار کی بہو بیٹیوں کے نام لے لے کر دیوتاؤں کے خاندان کی عزت اچھالی۔ ان کے بچّوں کو بددعائیں دیں۔ نئے دیوتا اور گوری کے ناجائز تعلّقات کی مجمع میں منادی کی۔ بوڑھی مانگو کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔

"یہ موا ساہوکار کا بیٹا تو ستّو باندھ کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے" وہ نحیف آواز میں کہہ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پھر دونوں ہاتھ دھرتی پر رکھ کر باآواز بلند بولی "قسم ہے اس دھرتی کی جس کی کوکھ سے رزق پیدا ہوتا ہے کہ میں بھوکی مر جاؤں گی مگر اپنی عزّت ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ اب یہ سرکار کا بیٹا ادھر آیا تو اسے کچا ہی نہ کھا جاؤں تو میرا نام مانگو نہیں" یہ کہتی ہوئی وہ جھونپڑی کے اندر چلی گئی اور پھر ہانپتی ہوئی فرش پر لیٹ گئی۔ آج اس نے برسوں کا غبار دل سے نکال دیا تھا۔ ساہوکار بستی کا دیوتا تھا۔ وہ آڑے وقت غریبوں کے کام آتا تھا۔ مگر بوڑھی مانگو خوب جانتی تھی کہ ساہوکار کے ہر سکّے کی قیمت کتنی بھاری ہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی ساہوکار کے غصّے سے ڈرتی تھی۔ مگر اب اسے کسی کا خوف نہ تھا۔ وہ آزاد تھی۔ چونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ فاقوں سے مر جائے گی۔ اور لوگ بھی تو مر رہے تھے۔ چوہوں کی طرح، کیڑے مکوڑوں کی طرح۔

"راجو! بیٹا دو گھونٹ پانی تو پلا دے" بوڑھی مانگو نے کمزور آواز میں کہا۔

"اچھا میں تالاب سے پانی لاتی ہوں" یہ کہتے ہوئے راجو اٹھ کر باہر چلی گئی۔

بوڑھی مانگو کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے ہوں۔ وہ چُپ چاپ تکتی رہی۔ اسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ راجو پانی لائے گی کس چیز میں۔ گھڑا اور پیالہ تو پانی میں بہہ گیا تھا۔ بھوک نے سوچ بچار کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔ بس اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے پانی مانگا اور راجو اُٹھ کر پانی لانے چلی گئی۔ بوڑھی مانگو کبھی آنکھیں کھولتی اور کبھی بند کر لیتی۔ آنکھیں بند کرتی تو اسے احساس ہوتا کہ وہ زمین میں دھنسی جا رہی ہے۔ آنکھیں کھولتی تو اُسے یقین ہو جاتا کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ اس جینے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ مگر آج اُسے محسوس ہوا کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ کچھ دن اور زندہ رہنے کی خواہش تڑپنے لگی۔ ”شاید اگلے برس فصلیں تباہ نہ ہوں۔ میں لوگوں کے برتن مانجھوں گی، کپڑے دھوؤں گی، راجو چکی پیسے گی، دھان کوٹے گی اور ہم دونوں پیٹ بھر کر بھات کھائیں گے۔“ یہ سوچتے ہوئے اس نے جھونپڑی میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر جیسے کوئی اس کے کان میں کہہ رہا ہو۔ ”اگر آج تمہیں بھات مل جائے تو پھر تم کبھی نہ مرو گی۔“

سورج مغربی اُفق پر شفق کی آخری سرخیاں پھیلا کر چھپ گیا۔ مگر راجو لوٹ کر نہ آئی۔ بوڑھی مانگو سونٹا ٹیکتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ریلوے لائن کے اس پار بنگلوں میں لیمپ روشن ہو چکے تھے۔ ہر آن بوڑھی مانگو کی تشویش بڑھ رہی تھی۔ آخر ہمت کر کے وہ تالاب کی طرف نکل گئی۔ راستے میں گوری کی جھونپڑی پڑتی تھی۔ سرر سرر، گوری مچھلی تل رہی تھی۔ مرچ مسالہ مچھلی اور سرسوں کے تیل کی مجموعی خوشبو بوڑھی مانگو کے نتھنوں میں گھس کر اودھم مچانے لگی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر گوری کی جھونپڑی میں

گھس جائے اور تلی ہوئی مچھلی کا ایک قتلا چھین کر لپ لپ کھاتی بھاگ جائے۔ اس کے قدم آپ سے آپ حرکت کرتے ہوئے گوری کی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ سونٹے کی کھٹ کھٹ سُن کر گوری باہر نکل آئی۔

"آؤ مانگو!" گوری نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

اور بوڑھی مانگو منہ موڑ کر تالاب کی طرف نکل گئی۔ راجو کہیں بھی نظر نہ آئی۔ تالاب کی سطح پر جھکے ہوئے پیڑ کی شاخوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر ایک سایہ تولیے سے بدن پونچھتا ہوا اس کے قریب آکر رُک گیا۔

"سلام مانگو۔" سایہ بولا اور یہ سایہ نئے دیوتا کا تھا۔ اگر اندھیرا نہ ہوتا تو بوڑھی مانگو نئے دیوتا کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ سکتی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں اس مسکراہٹ کو فوراً پہچان لیتیں۔ وہ اس روپہلی سکے کے بوجھ کو جھٹ محسوس کر لیتی۔

"مانگو! میں تیرا غلام ہوں۔ آج صرف دو چھٹانک چاول دے سکا۔ کیا کروں دام بہت چڑھ گئے ہیں۔ بہرحال اب روز کچھ نہ کچھ پہنچتا رہے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر تولیے سے بدن پونچھنے لگا۔

بوڑھی مانگو بُت بنی کھڑی تھی۔ اس کے لبوں کو جنبش تک نہ ہوئی۔ مچھلی کی بُو نے اس کے پیمانۂ صبر کو بُری طرح چھلکا دیا تھا۔ اس کا رُواں رُواں مچھلی اور بھات کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ مجسّم بھوک بن گئی تھی۔ آج وہ سونٹا بلند نہ کر سکی۔

نئے دیوتا نے جُھک کر سلام کیا اور پھر کھڑاؤں پہن کر کھٹ پٹ کرتا ہوا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

جب بوڑھی مانگو جھونپڑی میں داخل ہوئی تو راجو چولھے کے پاس بیٹھی ڈاؤ

سے مچھلی کاٹ رہی تھی۔ کوری ہنڈیا میں چاول اُبل رہے تھے۔ راجو کی آنکھیں جھکی جھکی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ننگے، سیاہ شانوں پر جابجا کھمبیوں کی سپیدی اور گھاس کی پتّیاں چپکی ہوئی تھیں۔ بوڑھی مانگو چپ چاپ صندوق پر بیٹھ گئی۔ کسی نے بات نہ کی۔

ہنڈیا سے بھاپ نکل رہی تھی۔ مچھلی کی بُو جھونپڑی کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھی مانگو کی روح سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئی اور پھر وہ بھوک سے دیکھنے لگی۔ بھوک سے سوچنے لگی۔ بھوک سے محسوس کرنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ہنڈیا پر جھپٹ پڑے۔ اس میں بھوکا عقاب پَر تولنے لگا۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اُس کے پاؤں کے پنجے کچے فرش کو چھُو رہے تھے، اُٹھ رہے تھے، چھو رہے تھے، اُس کے ہاتھوں کی اُنگلیوں میں چُل ہونے لگی۔ وقت رینگنے لگا۔ ایک ایک لمحہ سال سال ہوگیا۔ راجو نے پانی نچوڑ کر چاولوں کو دَم لگا دیا اور پھر مچھلی دھونے کے لیے جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

بھوکا عقاب بے قرار ہوگیا۔ بوڑھی مانگو سراپا بجلی بن گئی۔ اس نے ایک جست لگا کر چولھے پر چڑھی ہوئی ہنڈیا دونوں ہاتھوں سے پکڑلی۔ اور پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی آم کے پیڑوں کی طرف نکل گئی۔

خُون کی پگڈنڈی

سجاول چلتے چلتے وہاں پہنچ کر رُک گیا جہاں لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ ختم اور سُرخ مٹی کا ڈھالو راستہ شروع ہوتا تھا۔ سامنے نشیبی زمین پر درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ نظر آ رہے تھے اور کہیں کہیں آک اور جنگلی بیر کی جھاڑیاں، ہری ہری گھاس کے پس منظر میں سرسوں کے زرد رنگ کے پھول بڑے خوشنما لگ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر گائیں چر رہی تھیں۔ ایک جوہڑ کی کیچڑ میں بھوری اور کالی بھینسیں لوٹ رہی تھیں، بکریاں جھاڑیوں پر لگے بیر رکھے کانٹے دار پتّوں کو چبا رہی تھیں۔ چرواہے مختلف کاموں میں جُتے ہوئے تھے۔ کیکر کی چھال سے نکلا ہوا گوند اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ شہد کی مکھیوں کے چھتّے سے شہد نکالنے کا بندوبست کیا جا رہا تھا اور برگد کا بوڑھا پیڑ اپنے مضبوط اور موٹے تنے پر چوڑے چوڑے پتّوں، ڈالوں، شاخوں، جٹاؤں اور سُرخ بڑولیوں کا بوجھ اٹھائے جُوں کا تُوں کھڑا تھا۔ طوطے بڑولیاں کتر کتر کر

زمین پر پھینک رہے تھے۔ سُرخ مٹی کے ڈھلوان راستہ کی بلندی سے برگد کے بُوڑھے پیڑ تک کوئی دو سو قدم کا فاصلہ تھا اور وہ فاصلہ ایک دن سجاول نے بجلی کی سی تیزی سے طے کیا تھا۔ اُس دن سجاول نے زندگی کی سب سے بڑی چوٹ کھائی تھی۔ اُس روز فضلو نے اچانک وار کیا تھا۔ سجاول خوب جانتا تھا کہ وار اچانک بھی ہوا کرتے ہیں۔ چھوی کے ایک بھرپور وار سے تنی ہوئی گردن زمین پر جا پڑتی ہے۔ یہ تو گاؤں میں آئے دن ہوتا ہی رہتا تھا۔ ایک خون دوسرے خون کی وجہ بن جاتا تھا اور دوسرا خون تیسرے خون کی۔ اس طرح انتقام کا یہ سلسلہ پشت در پشت چلتا رہتا تھا۔ اسی قبیل کی خوفناک کڑیوں نے سجاول اور فضلو کے خاندانوں کو جکڑ رکھا تھا۔ دو سال پہلے فضلو کے بڑے بھائی کو سجاول کے منجھلے بھائی کریم نے قتل کیا تھا۔ اس لیے کہ فضلو کے بڑے بھائی نے چار برس پہلے کھیت میں سجاول کے بڑے بھائی کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دی تھی۔ اسی کھیت میں جس کی بس اتنی سی زمین کے لیے برسوں پہلے خون کی ندی بہہ گئی تھی۔ اُس دن سے یہ ندی رُک رُک کر بہتی چلی آ رہی تھی۔ اور اس لہو کی یلغار میں گزشتہ سال، اسی برگد کے بوڑھے پیڑ کے نیچے فضلو کی چھوی ہوا میں بلند ہوئی تھی۔

آج سرخ مٹی کے ڈھلوان راستے کی بلندی پر سجاول بُت بنا کھڑا تھا اور بیتے ہوئے خونی لمحوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی سخت اور کھُردری اُنگلیوں میں سان چڑھی چھوی چمک رہی تھی۔ اس کے پٹھوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ غیر ارادی طور پر اس کے بائیں ہاتھ کی متحرک انگلیوں نے ایک پودے کے چند پتے مسل ڈالے۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

اس کے خاندان نے ہمیشہ للکار کر حملہ کیا تھا۔ دھڑتے سے، کھلم کھلا، باقاعدہ پیغام بھجوا کر "فلاں دن اور فلاں وقت ہم وار کریں گے، تیار رہنا" اور پھر اس معین دن کو، صافے سروں پر لپیٹ کر، مونچھوں کو تاؤ دے، چھویاں ہاتھوں میں لے، بپھرے ہوئے جاٹ ہلہ بول دیتے۔ ندی کا بند ٹوٹ جاتا۔ ضربوں کی خوفناک آوازیں گونج اٹھتیں۔ سجاول کے سکڑ دادا کی روح کو سکون آجاتا۔ سجاول کا وہ جری سکڑ دادا جو خاص جاٹ تھا اور اپنے زمانے کا نامی لٹھ باز۔ اس کے لٹھ کی لکیر تمام گاؤں میں مشہور تھی۔ وہ واقعہ عدالت کے عین سامنے ہوا تھا۔ دونوں خاندانوں میں دیوانی کا مقدمہ چل رہا تھا۔ دوسری حاضری تھی۔ سماعت شروع ہونے سے پہلے دونوں فریقین دو بدو ہو گئے۔ سجاول کے سکڑ دادا نے بڑھ کر اپنے لٹھ سے زمین پر ایک لکیر کھینچی اور پھر اس لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گرج کر بولا "یہ ہے میرے کھیت کی مینڈھ، کوئی ہے مائی کا لال جو اس پر پاؤں رکھ سکے"۔ فضلو کے سکڑ دادا نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر سینہ تان کر لکیر پر پاؤں رکھ دیا۔ اسی لمحہ سجاول کے سکڑ دادا کا اٹھا ہوا لٹھ دھائیں دھائیں برس پڑا۔ آن کی آن میں فضلو کے سکڑ دادا کا بھیجا کھوپڑی سے الگ ہو کر مینڈھ کے اس پار جا پڑا۔ نتیجتہً دیوانی مقدمہ کے دوش بدوش فوجداری کا لاوا بھی پھوٹ پڑا۔ سجاول کا سکڑ دادا ایک خونی مستقبل کی بنا ڈال کر خود پھانسی پا گیا۔ انتقام کی آگ بھڑک کر دوگنی تیز ہو گئی۔ اس کے برعکس فضلو کے خاندان نے ہمیشہ بزدلانہ حملے کیے تھے۔ گزشتہ سال جب کریم برگد کے بوڑھے پیڑ کی گھنی چھاؤں میں پڑا بے خبر سو رہا تھا تو فضلو نے چھپ کر حملہ کیا تھا۔ اس دن بھی دھوپ آج کی طرح سنہری تھی۔ اس روز بھی فضا میں فصلوں کی بوباس رچی ہوئی تھی۔ سرسوں کے پودے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ برگد کے بوڑھے پیڑ کے

مضبوط اور موٹے تنے کے پاس کریم کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ جب سجاول کو اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی تھی تو وہ چھوی ہاتھوں میں بلند کیے کوندے بھرتا گاؤں کی گلیوں سے گزرا تھا۔ سرخ مٹی کے ڈھالو راستہ کی بلندی سے دو سو قدم کا فاصلہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عبور کر کے جائے وقوع پر جا پہنچا تھا اُس وقت اُس کی آنکھوں سے خون اُبل رہا تھا۔ بند بند دہکتے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ سانس کی تیز تیز آمد و رفت نتھنوں سے سُنائی دے رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے بائیں ہاتھ کی متحرک انگلیوں نے برگد کا ایک پتّہ مسل ڈالا تھا اور ڈنٹھل سے دودھ کے قطرے رِس کر کریم کے گرم لہو میں ٹپ ٹپ گر پڑے تھے۔

"بُزدل! کمینے!!" سجاول نے حقارت سے ہونٹ بھینچ لیے۔

مگر اب وہ بدلہ لے تو کس سے لے۔ فضلو جیل سے رہا ہونے کے چند ماہ بعد اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ اُس کا باپ اور بھائی ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔ لے دے کے فضلو کا اکلوتا بیٹا نیاز و باقی رہ گیا تھا۔ اور اُس پر ابھی ہاتھ اُٹھانا آئینِ جوانمردی کے خلاف تھا۔ نیاز و کا ابھی کنٹھ نکل رہا تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ہاں جب وہ عین عالمِ شباب میں ہوگا، سینہ تان کر چلے گا، تِرچھا صافہ باندھے گا، مونچھوں کو تاؤ دئے چھوی ہاتھ میں لے گاؤں کی گلیوں میں گھُومے گا، للکار کر جواب دے سکے گا، اس وقت سجاول کی پیاسی چھوی نیاز و کے گرم گرم اور جوان لہو میں نہا کر سرخروئی حاصل کر سکے گی۔

دفعتاً سُرخ سُرخ چونچوں اور ہرے ہرے پروں والے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے مشرق کی طرف نکل گئے۔ ایک دیہاتی لکڑیوں کا گٹھا نشیبی زمین پر رکھ کر

ٹھیکی لے رہا تھا۔ چرواہے ریوڑوں کو ہانک رہے تھے۔ سجاول کی پرچھائیں طویل ہو کر مشرق کی طرف پھیلنے لگی تھی۔

"چاچا سجاول تیرے کھیتوں میں بچھیا گھس گئی ہے۔" عقب سے ایک آواز آئی۔

سجاول نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے گاؤں کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ سجاول لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کھیت میں پہنچا۔ ایک سفید بچھیا دُم ہلا ہلا کر پودے چبا رہی تھی پاؤں کی چاپ سنتے ہی بچھیا نے گردن اُٹھا کر سجاول کی طرف دیکھا۔ ہوا میں اُٹھی ہوئی چھوی بچھیا کو چھوئے بغیر لوٹ آئی۔ وہ بچھیا بھی تو گونگی تھی، سجاول کی اپنی بیٹی گلشن کی طرح۔ وہ بھی تو چپ چاپ دیکھے جا رہی تھی۔ سیاہ اور چمکیلی آنکھوں والی بچھیا جس کی جلد کے سفید بالوں کو گائے نے چاٹ چاٹ کر چمکا رکھا تھا۔ بچھیا پھر پودوں کے اوپری حصے جھپ جھپ کھانے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پھٹے ہوئے سُم پودوں کو روندتے جا رہے تھے۔ بجائے اس کے کہ سجاول اُسے مار کر بھگا دیتا وہ اپنی فصل کو پامال ہوتے دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ اُسی طرح جس طرح وہ اپنی ننھی گلشن کو دیکھ کر باغ باغ ہو جایا کرتا تھا۔ جب گلشن کوئی مٹی کا برتن توڑ دیا کرتی تھی تو وہ اپنی بیوی زینباں سے کہا کرتا تھا "گلشن کی امّی پیسے وصول ہو گئے۔"

چھویوں کے وار روکنے والے سخت اور مضبوط ہاتھوں میں گلاب کی پتّیوں کی نرمی آگئی۔ خونی آنکھوں میں محبت کی لَو چمکنے لگی۔ سجاول نے چمکارتے ہوئے بچھیا کی پیٹھ تھپتھپائی۔ بچھیا کلیلیں بھرتی ہوئی گاؤں کی طرف بھاگ گئی۔ سجاول کھیت سے نکل کر کچے راستہ پر ہولیا۔ یکایک فاختاؤں کا جوڑا ایک درخت سے اُڑ کر

دوسرے درخت پر جا بیٹھا۔ ایک سُرمئی رنگ کی فاختہ سجاول کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ وہ سُرمئی رنگ کی فاختہ جس کے گلے میں کنٹھا تھا۔ جسے سجاول نے اپنے گھر کے آنگن میں ایک نوکیلے پتھر کا نشانہ بنا کر گھائل کر ڈالا تھا۔ وہ روح فرسا منظر دیکھ کر زیناں کے سنسنیاں چھوٹ گئی تھیں۔ اُن دنوں زیناں کے کچے پکے دن تھے۔ اُس کے عقیدے کے مطابق فاختہ کو مارنا تو در کنار اسے چھیڑنا بھی گناہ تھا۔ چنانچہ اُس دن سے زیناں کے دل میں چور بیٹھ گیا۔ اور اس کا اندر والا پکار پکار کر کہنے لگا "تجھے اس گناہ کی سزا ضرور ملے گی۔" دردِ زہ کی چیخوں میں بھی زیناں وہ منظر نہ بھول سکی۔ لیکن جب ننھی گلشن کا چاند سا مکھڑا آنکھوں کے سامنے آ گیا تو رفتہ رفتہ ماضی کی اور بہت سی وابستگیوں کے ساتھ فاختہ والی بات بھی تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی۔ گلشن سیانی ہو گئی پر اُس کی زبان نہ کُھلی۔ ہاں اس کی قوتِ سامعہ بلا کی تیز تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی اس علاقہ میں دو چار اور بھی پیدائشی گونگے تھے، جو ساتھ ہی ساتھ مکمل طور پر بہرے بھی تھے۔ مگر گلشن صرف گونگی تھی۔ اور اس عارضہ کو دور کرنے کے لیے گلشن کے ماں باپ نے ہزاروں جتن کیے۔ منتیں مانیں۔ تعویذ گنڈے کیے۔ زیناں مزاروں پر آنچل پھیلا پھیلا کر روئی۔ سجاول نے فقیروں سے لمبی چوڑی دعائیں خریدیں۔ ماں باپ کی اس ذہنی اور فکری افراتفری میں گلشن قد نکال کر زیناں جتنی لمبی ہو گئی۔ اور ایک دن گلشن نے جب اپنی ماں کی قمیص پہنی تو زیناں کو اچانک اپنی بیٹی کی بھرپور جوانی کا شدید احساس ہوا۔ چھینٹ کی وہ قمیص گلشن کے گورے پنڈے پر اس قدر بھنچ کر آئی کہ بغلوں کے نیچے کپڑا دھجی ہو کر رہ گیا۔ گلشن خود تو گونگی ہی رہی مگر اُس

کا جسم باتیں کرنے لگا۔

اور اب جب کہ سجاول کچے راستے پر چلتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے وہی سُرمئی رنگ کی فاختہ گھوم رہی تھی جس کے گلے میں کنٹھا تھا جس کا برسوں پہلے اُس نے خون کیا تھا۔

چرواہے ریوڑ ہانکتے ہوئے سجاول سے آگے نکل گئے۔ چوپائے اپنی جانی پہچانی راہ پر تیزی سے چل رہے تھے۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ بھینس کی پیٹھ پہ بیٹھا ہوا چھوکرا گلے میں غلیل ڈالے باآوازِ بلند گا رہا تھا۔

ہتھ سوچ کے گندل نوں پاویں

تے کہیڑی ایں توں ساگ توڑدی

سرسوں کی بہاریں ٹپے کے بسنتی بول دل کے دروازے پر دستک دینے لگے۔ سجاول نے چلتے چلتے مسکرا کر گانے والے چھوکرے کی طرف دیکھا۔ ایک کھیت میں گاؤں کی دو کھلنڈری لڑکیاں سرسوں کی گندلیں توڑتے توڑتے ٹھٹھک گئیں۔

"ہتھ سوچ کے گندل نوں پاویں"

اُن کے ہاتھ رُک گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگیں۔

"تے کہیڑی ایں توں ساگ توڑدی"

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھکھنے لگیں اور پھر جلدی جلدی سرسوں کی گندلیں توڑ توڑ کر جھولیاں بھرنے لگیں۔ فضا میں پھیلی ہوئی گرد چھٹ گئی۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کی جگہ فصلوں کی بھینی بھینی مہک نے لے لی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں

میں پودے لہرانے لگے۔

گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا میدان پڑتا تھا۔ وہاں سبز سبز گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس گھاس پر گھورے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی گاؤں کی دولت تھی جو گل سڑ کر کھاد بن جاتی تھی۔ یہ گاؤں کا پچھواڑہ تھا۔ گاؤں کا اگواڑا کچے راستے سے شروع ہو کر شہر کو جانے والی پکی سڑک سے جا ملتا تھا۔ پکی سڑک کے دونوں طرف شیشم کے درخت کھڑے تھے۔ وہیں سے دن میں پانچ مرتبہ لاری شہر کو جاتی تھی۔ سڑک کے اس پار ایک پگڈنڈی تھی جو سیدھی شہر کی منڈی میں جا نکلتی تھی۔

سجاول ابھی میدان سے کچھ دور تھا کہ گھوروں کے پیچھے سے عورتوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی۔ وہ پانی بھرنے کنوئیں کی طرف جا رہی تھیں۔ ہر ایک کے سر پر اینڈوا تھا اور اُس پر گھڑے اور گھڑولیاں۔ وہ ننگے پاؤں چل رہی تھیں۔ انھوں نے رنگ برنگ کے دوپٹے اوڑھ رکھے تھے۔ ان میں زیناں بھی تھی۔ سرخ و سفید، لانبی، مضبوط اور تندرست دیہاتن۔ ایک خالی گھڑا اُس کے سر پر تھا اور دوسرا کولھے پر۔ پہلے گلشن پانی بھرنے جایا کرتی تھی۔ مگر کچھ عرصہ سے یہ کام زیناں نے سنبھال لیا تھا۔ سجاول جب پہلے گھورے کے پاس پہنچا تو گوبر کی بدبو اُس کے نتھنوں میں گھُسنے لگی۔ رنگین پروں والے مرغ جن کے سروں پر سرخ کلغیاں تھیں اپنے پنجوں سے کوڑا کرکٹ کرید کرید کر کیڑے مکوڑے کھا رہے تھے۔ ایک مرغی کٹ کٹ کرتی چوزوں کو چگا رہی تھی۔ یکایک ایک چیل آسمان کی بلندیوں سے غوطہ لگا کر نیچے آئی اور ایک گھورے کو چھو کر شائیں شائیں کرتی اُوپر اُڑ گئی۔ مرغی بہت زور سے چیخی اور پھر اُس نے پر پھیلا کر چوزوں کو اپنے نیچے چھپا لیا۔

سجاول جب گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہُوا تو مغرب میں شفق کی سرخی پھیل چکی تھی۔ گلی کے دونوں طرف کچے مکان کھڑے تھے۔ زندگی روپ روپ میں حرکت کر رہی تھی۔ نمبردار کے گھر کے آنگن میں محفل جمی ہوئی تھی۔ حقے کے دَور چل رہے تھے۔ پٹواری کی کلف لگی پگڑی کا طُرّہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ نہایت رعب داب سے پلنگ پر بیٹھا قانونِ اراضی کی گُتھیاں سلجھا رہا تھا۔ ایک شخص نمبردار کے بانکے صاحبزادے کے گھوڑے کو دوارہ کھلا رہا تھا۔ اور اندر سے سوجی بُھننے کی خوشبو تیزی سے آ رہی تھی۔ ایک آنگن میں ایک دیہاتن تنور کے پاس کھڑی آٹے کے پیڑے بنا رہی تھی اور اس کی کانچ کی چوڑیوں کی جھنکار گلی میں سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ والے آنگن میں ایک مرد گنڈاسے سے چری کاٹ رہا تھا۔ ایک عورت چھاج میں غلہ پھٹک رہی تھی۔ اگلے صحن میں ایک گٹھے ہوئے بدن والا گوجر، پاؤں کے بل بیٹھا، بالٹی گھٹنوں میں دبائے بھینس کا دودھ دوہ رہا تھا۔ ایک نوخیز لڑکی کٹیا کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی ہاتھ میں پکڑے کچھ سوچ رہی تھی بھینس کٹیا کے بدن کو چاٹ رہی تھی۔ گھر گھر سے دودھ دوہنے کی آوازیں سجاول کے ساتھ ساتھ چلتی گئیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی۔ بیل گاڑیاں شہر کی طرف سے لوٹ کر آ رہی تھیں۔ صبح سے جُتے ہوئے بیل اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ گاڑی بانوں کے چہرے گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ پر ان کے ہونٹوں پر ایک سکون آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گلی کا موڑ کاٹ کر سجاول نے اپنے گھر کے صحن میں قدم رکھا۔ گلشن ناند کے پاس جُھکی ہوئی بالٹی کا دودھ مٹکی میں اُلٹا رہی تھی۔ کٹرا بھینس کی کھیری کو ٹکریں مار مار کر تھنوں کو چوس رہا تھا۔ تنور میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ صحنک میں رکھے ہوئے آٹے کے پیڑے چنگیری

سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بٹورے کے پاس سہاگا، ہل اور پنجالی کھڑی تھی۔
چھت پر سوکھی چری کی پولیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ بھینس نے دوسری مرتبہ دودھ اُتارا۔
گلشن نے کٹرے کو کھونٹے سے باندھا اور پھر پیڑھی پر بیٹھ کر دودھ دوہنے لگی۔ گلشن اپنے
کام میں مگن تھی۔ پر اس نے کنکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس کا باپ چپکے سے اندر چلا آیا
ہے۔ اُس نے چھوی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی ہے۔ اُس نے اپنا صافہ اُتار کر کھٹولے
کے پائے پر رکھ دیا ہے اور اب وہ گھڑے سے پیالہ بھر کر پانی پی رہا ہے۔ دوسری
مرتبہ دودھ دوہ کر گلشن نے کٹرے کو چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے کونے میں گائے کو
بھوسہ، کھلی اور بنولے کی سانی ڈالنے لگی۔ سجاول آنگن میں بچھے ہوئے کھٹولے
پر بیٹھ گیا۔ دالان کے ایک کونے میں چکّی کے پاس اڈا کھڑا تھا۔ جس پر نارنجی رنگ
کے ریشمی دھاگے چڑھے ہوئے تھے۔ آج صبح جب سجاول گھر سے نکلا تھا تو گلشن
ان نارنجی رنگ کے دھاگوں سے ازاربند بُن رہی تھی۔ بھڑولی کے پاس مٹی کے پیالے
کے ٹکڑے جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ وہ پیالہ اتفاق سے نہیں ٹوٹا تھا بلکہ
سجاول نے غصّے میں زمین پر دے مارا تھا۔ اس لیے کہ آج صبح جب سجاول چھوی
ہاتھ میں لے کر دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو زیناں بے خیالی میں اُسے عقب سے
پکار بیٹھی۔ دوسرے دیہاتیوں کی طرح وہ بھی ایسے بلانے کو بُری فال سمجھتا تھا خصوصاً
اُس وقت جب کہ وہ بیلوں کی جوڑی خریدنے کے لیے منڈی جا رہا تھا۔ زیناں آواز
دے کر خود پریشان ہو گئی تھی۔ گلشن کی لانبی سپید انگلیاں نارنجی رنگ کے ریشمی
دھاگوں اور تیلیوں سے کھیلتے کھیلتے دفعتاً رُک گئی تھیں، اُس نے گھبرائی ہوئی نظروں
سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور سجاول طیش میں مٹی کا پیالہ زمین پر پھینک کر

کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔

گلشن نے گاٹے کو سانی دے کر ہاتھ دھوئے۔ چڑھی ہوئی آستینوں کو کھینچ کر کلائیاں ڈھانپیں اور پھر اپنا مقیش والا سیاہ دوپٹہ قرینے سے اوڑھ کر حقہ تازہ کرنے بیٹھ گئی۔ لانبی لانبی سپید انگلیوں نے ضامن تھام کر نیچہ نکالا۔ باسی پانی انڈیل کر تازہ پانی فرشی میں ڈالا۔ پھر گلشن حقہ باپ کے سامنے رکھ کر تمباکو لینے اندر چلی گئی۔ سجاول نے حقے کی نے منہ میں لے کر پھونک ماری۔ پانی کا فوارہ نکل کر کچے فرش پر جا پڑا۔ گلشن تمباکو لے آئی۔ سجاول نے گٹی نکال کر چلم کو جھاڑا اور پھر اس میں میٹھے تمباکو کی تہہ جمانے لگا۔ اتنے میں زیناں آگئی۔ اُس کے سر پر دو گھڑے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے اُس کے رخساروں پر سے پھسل پھسل کر نیچے گر رہے تھے۔ زلفوں کی ایک لٹ اُس کے ماتھے پر کنڈل مارے بیٹھی تھی۔ چاندی کے بالے کانوں میں جھول رہے تھے۔ اوپر کو اُٹھے ہوئے بازوؤں نے دو سڈول تکونوں کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ تنی ہوئی گردن اور کھنچے ہوئے شانوں نے جسم کے بالائی حصے میں بلا کی کساوٹ پیدا کر رکھی تھی۔ سجاول نے اُٹھ کر اُوپر والا گھڑا اتارا۔ زیناں نے مسکراتے ہوئے دوسرے گھڑے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ، آہستہ سے گھڑونچی پر رکھ دیا۔ سجاول بھی مسکرا پڑا۔ گلشن نے اندر جا کر لالٹین روشن کر دی۔ جھلملاتی لَو کے ساتھ ہی گھریلو زندگی عود کر آئی۔ سجاول نے اُپلے کی آگ چمٹے سے پکڑ کر چلم پر رکھی۔ گڑگڑا کے دم مارا۔ تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ زیناں نے دوپٹا اُتار کر الگنی پر ڈال دیا۔ آستینیں چڑھا کر ہاتھ دھوئے۔ کریدنی سے تنور کی آگ کو الٹ پلٹ کیا۔ اور پھر تنور کے اندر پانی کے چھینٹے مار کر روٹیاں لگانے لگی۔

سجاول ہاتھ دھو کر کھٹولے پر آلتی پالتی مارے منتظر بیٹھا تھا۔ روٹیاں پک چکیں تو زیناں نے گرم روٹیوں پر مکھن ڈالا، ہنڈیا سے سرسوں کا ساگ لے کر رکابی بھری اور پھر چنگیری سجاول کے سامنے رکھ کر خود پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"گُلشن بٹیا! آج کل تیرے ابّا کو غصّہ بہت آتا ہے۔" زیناں بولی۔ پیڑھی پر بیٹھی ہوئی گلشن نے آنکھیں جھکا لیں۔

"گُلشن بٹیا! تیرے ابّا کے دماغ میں خشکی زیادہ ہو گئی ہے نا۔ تیری امّی اسے مکھن جو نہیں کھلاتی۔"

سجاول منہ کے نوالے کو چباتے اور ہاتھ کے نوالے سے مکھن کو سمیٹتے ہوئے بولا۔ اُس کی آواز حلق میں اٹک اٹک کر کچھ اس انداز سے نکلی کہ زیناں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گُلشن کے ہونٹوں پر بھی ایک تبسم کھیلنے لگا۔ سجاول کو احساس ہوا جیسے گلشن بھی کچھ کہنا چاہتی ہو۔ یہ احساس سجاول کو ہزاروں بار ہوا تھا۔ وہ گُلشن کے متعلق اکثر سوچا کرتا تھا۔ ہل چلاتے وقت، بیج بوتے وقت اور خصوصاً اُس وقت جب گرمیوں کی رات میں اُس کی آنکھ کُھل جاتی اور وہ چھت پر بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹے لیٹے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہتا۔ اُس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے چاند تارے بھی گونگے ہیں۔ آسمان بھی گونگا ہے۔ کبھی کبھی وہ درانتی چلاتے وقت سوچنے لگتا کہ یہ سُنہرے خوشوں والے لانبے لانبے گیہوں کے پودے بھی گونگے ہیں۔ ہر شے چُپ ہے۔ اگر گُلشن بولتی تو اُس کی آواز کیسی ہوتی۔ اس کی پہلی بات کیا ہوتی۔ وہ کون سی چیز مجھ سے مانگتی، ڈھیر سے کھلونے، یہ بڑا طباخ جلیبیوں کا۔ اور پھر دفعتاً ماضی کا تصوّر درانتی کی سائڑ سائڑ میں ڈوب جاتا۔

اور اُس کے خیالات کروٹ بدل کر حال کی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگتے۔ وہ سوچتا:
"شاید گلشن مجھ سے سونے کی گانی مانگتی۔ زری کی پوٹھوہاری جوتی کی فرمائش کرتی"
پھر اسے خیال آتا: "گیہوں کے پودے جب لانبے اور جوان ہو جاتے ہیں تو
کاٹ کر دھرتی سے جُدا کر دیے جاتے ہیں۔ مگر گلشن تو ان پودوں سے کہیں
زیادہ لانبی ہو گئی ہے!" اُس کا ذہن ایک دوراہے پر پہنچ کر ڈانواں ڈول ہو جاتا۔
وہ کھلونوں اور جلیبیوں کی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ کر وہاں پہنچ جاتا جہاں سامنے سے
آتی ہوئی گلشن کو دیکھ کر اس کی نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ آج بھی روٹی کے نوالے
نگلتے ہوئے وہ ایسی ہی باتیں سوچ رہا تھا۔ پھر جیسا کہ عموماً ہوا کرتا تھا اُس کا فرض
اُسے پکارنے لگا ــــ انتقام ــــ خون کا بدلہ خون ــــ اور جب اسے یہ خیال
آتا تو باقی تمام خیالات پسِ پشت چلے جاتے۔ اور پھر وہ اپنے جسم کی گرمی کو خود
محسوس کرنے لگتا۔ یہ نہ بجھنے والی آگ تو اُس کے ذہن میں ہر وقت موجود رہتی ہی تھی۔
ہاں جیتی جاگتی زندگی میں دوسرے خیالات بھی آتے اور چلے جاتے۔ پرچھائیاں
پھیلتیں اور گم ہو جاتیں۔ بوندا باندی ہوتی اور تھم جاتی۔ لیکن کریم کے لہو کی یاد ایک
آندھی بن کر آتی اور اس آندھی کی زد میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیاں خس و خاشاک
کی طرح اڑ کر کہیں بہت دُور چلی جاتیں اور زیناں؟ تو اس سلسلے میں بہت کچھ سوچتی تھی۔
خصوصاً اُس وقت جب وہ چرخہ کات رہی ہوتی، تکلے پر پونیاں بنا رہی ہوتی مسلسل
گھوں گھوں کی آوازوں میں اُس کے خیالات کہاں سے کہاں نکل جاتے۔ دہی بلوتے
یا چکّی پیستے میں۔ گنڈا اسے سے چری کاٹتے یا اُپلے تھاپتے میں، غرضیکہ روزمرہ کی
زندگی کے ہر اُس رُخ میں جہاں فعل اور صوت مل کر ذہن کو سوچنے پر اُکساتے، زیناں

اپنے خیالات کے ذرّوں سے ایک وسیع و بسیط صحرا پیدا کر لیتی۔ آج بھی نہ جانے کس خیال کو بھول جانے کی کوشش میں وہ پیڑھی سے اُٹھ کر پلنگڑی کی ادوائن کسنے لگی۔ گلشن بھی اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

دفعتاً کہیں دور سے جوڑی کی پُرسوز آواز بلند ہوئی۔ کسی نے مخصوص لَے میں مرزا صاحباں کے بول الاپ کر فضا میں ہلچل مچا دی۔ گلشن نے مچان پر سے توشک اٹھا کر پلنگ کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر لمحہ بھر کے لیے اُس کے پاؤں حرکت کرنا بھول گئے۔ اور نہ جانے کیوں اُسے یوں لگا جیسے وہ خود اپنے وجود سے الگ ہو کر ہوا کی لہروں پر تڑپتے ہوئے نغمے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جوڑی کی آواز سُن کر سجاول کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ برسوں پہلے وہ بھی جوڑی بجایا کرتا تھا۔ اُس وقت اس کے سینے میں بے پناہ دم تھا۔ جوڑی بجاتے وقت اُس کی گردن کی نسیں اس قدر پھول جایا کرتی تھیں کہ ایک ایک گِن لو۔ یہی رُت تھی، ایسا ہی سماں تھا جب اُس کی جوڑی سے نکلے ہوئے نغمے نے نقطۂ عروج پر پہنچ کر کسی کو پکارا تھا اور گاؤں کی ایک کھلنڈری دیہاتن وہ پکار سُن کر بے تاب ہو گئی تھی۔ وہ سرخ و سفید اور مضبوط جسم جُثّے کی دیہاتن اب اُس کی زندگی کی شریک تھی۔ سجاول کے خیالوں نے آنکھ جھپکتے میں حال کے ڈانڈے ماضی سے ملا کر مسرّت کی ایک ہلکی سی چسکی لے لی۔

رات کے پچھلے پہر زیناں کی آنکھ کھل گئی۔ لالٹین بجھ چکی تھی۔ سجاول خرّاٹے لے رہا تھا۔ زیناں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ چاند کی ترچھی کرنیں مستطیل صورت میں دروازے کی سردل سے لے کر سامنے دیوار تک پھیل گئیں۔ سجاول کے سرہانے

رکھی ہوئی چھوی چمک اُٹھی۔ گلشن کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ زیناں تیز تیز قدموں سے بھوسے والی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

"گلشن" زیناں نے اندھیرے میں آہستہ سے پکارا۔ کوئی جواب نہ پاکر اس نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا کر دیوار کو چھوا اور پھر جیسے کوئی اندھا راستہ ٹٹول رہا ہو، اُس نے کوٹھری کا کونہ کونہ چھان مارا۔ جب وہ باہر نکل کر آنگن میں آئی تو اناج کے پودوں کا چورا اُس کے سر کے بالوں، کپڑوں، گردن اور اُس کے چہرے پر چپکا ہوا تھا۔ اس نے چاروں طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ اُس کے قدم خود بخود چھت پر جانے والی سیڑھی کی طرف بڑھنے لگے۔ کوئی دو ماہ پہلے زیناں نے گلشن کو کنوئیں پر جانے سے منع کیا تھا۔ اس دوران میں گلشن کسی نہ کسی بات پر تین مرتبہ روٹھ چکی تھی۔ پہلی مرتبہ گلشن کی چارپائی خالی پاکر زیناں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی تھی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس نے بھوسے والی کوٹھڑی میں جاکر دیکھا تھا تو گلشن زار و قطار رو رہی تھی۔ دوسری مرتبہ چاندنی رات میں زیناں نے گلشن کو چھپا کے گلے میں باہیں ڈالے سسکیاں لیتے دیکھا تھا تو اُس کا اپنا گلا رندھ گیا تھا اور اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ گلشن کو کنوئیں پر جانے کی اجازت دے دے۔ مگر اگلے دن اُس نے اپنے پہلے خیال کو دوسرے خیال پر ترجیح دینے ہی میں مصلحت سمجھی تھی۔ اس لیے کہ گلشن میٹھا سال پار کر چکی تھی اور اب وہ اپنی کنگھی چوٹی اور سُرمے دندا سے میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔ قدرت نے اسے قوتِ گویائی عطا نہ کی تھی مگر اس کی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر آن بولتی رہتی تھیں۔ اس بات پر تو گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے اشاروں کنایوں سے زیناں کو چوکنا کر دیا تھا اور زیناں جیسی سُگھڑ عورت کو چوکس ہونے میں بھلا دیر ہی کیا لگتی۔

تیسری مرتبہ جب گُلشن روٹھی تھی تو اُس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس رات گُلشن کی چارپائی خالی پا کر جب زیناں تلاش کرتے کرتے چھت پر پہنچی تھی تو گُلشن چری کی پولیوں پر پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ چنانچہ زیناں اکثر رات کو اُٹھ کر گُلشن کی چارپائی دیکھ لیا کرتی تھی۔ لیکن آج جب وہ چھت پر پہنچی تو گُلشن کی بجائے ایک کالی بلی چری کی پولیوں پر پڑی سو رہی تھی۔ پاؤں کی چاپ سُن کر بلی منڈیر سے کُود کر گلی میں چلی گئی۔ زیناں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایسے وقت کالی بلی کا نظر آنا بدشگونی تھی۔ صبح اس کی بائیں آنکھ بھی کئی بار پھڑکی تھی۔ اسے وہ سرمئی رنگ کی فاختہ یاد آ گئی۔ جس کے گلے میں کنٹھا تھا، جسے برسوں پہلے سجاول نے اپنے گھر کے آنگن میں ایک نوکیلے پتھر کا نشانہ بنا کر گھائل کر ڈالا تھا۔ زیناں پر ایک نامعلوم خوف طاری ہو گیا۔ واردات کی نوعیت اتنی اچانک تھی کہ اس کی عقل جواب دینے لگی۔ وہ پاگلوں کی طرح گھُور گھُور کر خلا میں دیکھنے لگی "گُلشن! گُلشن!" اس نے اضطراری حالت میں سرگوشی کی۔ اُس کا حلق سُوکھ گیا۔ رُواں رُواں کانپنے لگا "جب سجاول کو پتہ چلے گا تو ہو سکتا ہے اس کی چھوی سب سے پہلے میری گردن اُڑا کر رکھ دے"۔ زیناں سوچنے لگی "مگر میری گونگی بچی جا ہی کہاں سکتی ہے؟ یہیں کہیں ہو گی"۔ زیناں اپنے دل کو دھارس دینے لگی

دفعتاً زیناں کی نگاہ کچے راستے پر پڑی جو شہر کو جانے والی سڑک سے جا ملتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے پیڑ کھڑے تھے۔ سڑک کے اُس پار شہر کو جانے والی پگڈنڈی ایک سفید لکیر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ کچے راستے پر دو سائے تیز تیز قدموں سے شہر کی سمت بڑھتے جا رہے تھے۔ سیاہ دوپٹے پر مقیش کے ننھے ننھے جگنو چمک رہے تھے۔ زیناں کے سینے میں ایک درد سا ہونے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جن ہونٹوں نے اس کی چھاتیوں کو چوس چوس کر زندگی کی رونق حاصل کی تھی وہی ہونٹ آج اس سے

جدا ہو رہے ہیں۔

"گلشن۔" زیناں نے بھرائی ہوئی آواز سے پکارا اور پھر اپنے دوپٹے کا آنچل پکڑنے کے لیے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ یکایک وہ پتھر کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔ اس کی کہنی ایک چٹان سے ٹکرائی۔ وہ چٹان جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جس کے ہاتھ میں سان چڑھی چھوی چمک رہی تھی۔ سجاول اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ زیناں گردن موڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکی۔ اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ دفعتاً چٹان نے جنبش کی اور زیناں کو یوں معلوم ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ سجاول کے بھاری قدموں نے چھت کا سینہ ہلا دیا۔ اور پھر وہ منڈیر سے کود کر گلی میں چلا گیا۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گلی سے دوڑ کر کچے راستہ پر پہنچا۔ چاند کی کرنوں میں اُس کی چھوی کوندے بھرنے لگی۔ آوارہ کتے بھوں بھوں کر کے خاموش ہو گئے۔ کچے راستہ پر سجاول کا تن آور جثہ گرد کے بادل اُڑاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ جیسے وہ ایک بے پناہ طوفان بن گیا ہو، جیسے اب کوئی شے بھی اُس کی زد میں آ کر سلامت نہ رہ سکے گی۔ اُس نے چھوی کے دستے کو ہوا میں بلند کر رکھا تھا۔ اس کے پاؤں ہر شے کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک آک کے پودے کی شاخیں اُس کے کھُردرے پاؤں کے نیچے دب کر سفید سفید لعاب ٹپکانے لگیں۔ مٹی کے ڈھیلے اُس کی ایڑیوں کے نیچے آ کر چوُر چوُر ہو گئے۔ شیشم کے پیڑوں کے قریب اُس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ اُس کی تیز تیز اور بلند سانس کی آمد و رفت چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی میں وحشت ناک معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک پیڑ کے تنے پر پڑی۔ جس کی آڑ میں مقیش کے

ننھے ننھے جگنو چمک رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے بلند و بالا درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن کی پرچھائیاں آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک طویل سایے کی صورت میں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

سجاول کی خوفناک للکار سُن کر دو سایے وہاں سے بھاگ کر دوسرے درخت کے پیچھے چھپ گئے اور پھر وہاں سے دوڑ کر تیسرے درخت کے پیچھے۔ سجاول نے پھر آواز دی۔ اِس مرتبہ اُس کی گرج اِس قدر بلند اور ڈراؤنی تھی کہ الاماں۔ دو کانپتے ہوئے سائے تیزی سے بھاگ کر شہر کو جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیے۔ اب وہ درختوں کے سایے سے نکل کر چاندنی میں چلے گئے تھے۔ آنِ واحد میں سجاول اُن کے قریب پہنچ گیا۔ سامنے گلشن کھڑی تھی۔ اُس کی لال لال جیب نے ایک محشر بپا کر دیا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر نیاز و کو چھپا رہی تھی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح گھونسلے کے پاس مرغی نے پر پھیلا کر اپنے چوزوں کو چھپا لیا تھا۔

گلشن اور نیاز و قدم قدم پیچھے ہٹنے لگے۔

"ہٹو سامنے سے بدذات۔" سجاول نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

گلشن کی لال لال جیب منہ سے باہر نکل کر یوں حرکت کرنے لگی جیسے وہ ابھی کھنچ کر گدّی سے الگ ہو جائے گی۔ گلشن کا سانس پھولنے لگا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے تھرتھرانے لگے۔ جیسے اُس کی گونگی آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہو۔ "بابل اِس چھوی سے مجھے مار ڈالو مگر نیاز و کو کچھ نہ کہنا۔ وہ جوڑی بجاتا ہے، اس کے گیتوں میں جادو ہے۔"

"ہٹ جاؤ ناگن ورنہ میں تمھاری کھوپڑی کو پہلے چکنا چور کر دوں گا۔" سجاول نے گرج کر کہا۔ نیاز و مارے خوف کے لرز رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر موت کی

زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گلشن کی ٹانگوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور خوفزدہ نگاہوں سے سجاول کی طرف دیکھنے لگا۔

گلشن باپ کے قریب آگئی۔ نیازو بھی اس کی ٹانگوں کی آڑ لے کر گھٹنوں کے بل آگے کھسک آیا۔ گلشن بدستور اپنی لال لال جیب کو شدت کے ساتھ گھما رہی تھی۔ اُس کے ہاتھوں کے پیہم اشاروں نے فضا میں ایک جوار بھاٹا پیدا کر دیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ سیاہ دوپٹا زمین پر گر پڑا۔ سجاول کی نگاہوں میں کریم کی لاش گھومنے لگی۔ اس کے رگ و ریشے میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ اُس نے چمکتی ہوئی چھوی کو بلند کر لیا۔ یکایک سجاول کو یوں لگا جیسے گلشن کی آنکھوں کے ڈھیلے ابھی پھٹ پڑیں گے۔

وہ ایک لمحہ بیک وقت ماضی حال اور مستقبل کا لمحہ بن کر گزرا۔ اُس ایک لمحہ کے بطن سے لمحات کے قافلے پیدا ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

گلشن اپنے کورے پنڈے کی چادر، نیازو کو اوڑھا کر چھوی کی طرف اُسی طرح دیکھنے لگی۔ جس طرح سُرمئی رنگ کی فاختہ نے آخری بار سجاول کی طرف دیکھا تھا۔

ماضی کے غار سے نوجوان سجاول اُبھر کر جوڑی بجاتا ہوا زیناں کے گاؤں کی طرف نکل گیا۔

یکایک سجاول کے ہاتھ کانپنے لگے۔ نہ جانے کیوں یک دم اُس کا گلا بھر آیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے چمکے۔ اُس نے چھوی زور سے پرے پھینک دی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چاندنی سے نکل کر درختوں کے طویل سایے میں گم ہو گیا۔

اِینٹ کی بیگم

چند ہی لمحے میں ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کہ ہم سب ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں جب ٹرین پہاڑ تلی اسٹیشن پر رُکی تو برج کی پہلی بازی شروع ہو چکی تھی اور جس وقت گارڈ نے وہاں سے روانگی کی وِسل دی تو میری تیسری ڈیپ فینس پِٹ چکی تھی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبّے میں میرے علاوہ صرف تین اور مسافر تھے۔ دایئں لوئر برتھ پر سول سرجن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا، مونچھیں چھوٹی چھوٹی کمانیں، بھاری بھاری پپوٹوں تلے بڑی بڑی سرخ آنکھیں ہٹف کالر پر بھورے رنگ کی بوٹائی اور اسی رنگ کے چارخانہ دار ٹویڈ کے کوٹ نے اس کی شخصیت کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس کا پارٹنر جرمن انجنیئر بایئں لوئر برتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاکی لباس میں فوجی افسر معلوم ہو رہا تھا۔ وقت نے اس کے سرخ چہرے پر گہری لکیریں ڈال دی تھیں۔ زرد زرد دانتوں کے درمیان سگار دبائے ہوئے

وہ ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا۔

لوئر برتھوں کے درمیان میں ہولڈال پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے مقابل میرا پارٹنر ایک کالے ٹرنک پر پالتی مارے دوسروں کی طرح بائیں ہاتھ میں آسمانی رنگ کے پتے تھامے کھیل میں منہمک تھا۔ دورانِ گفتگو میں وہ ہم سب کو اپنے چائے کے باغوں کی سیر کرنے کی دعوت دے چکا تھا۔ بات بات پر قہقہہ لگانا شاید اس کی عادت تھی۔ ڈبے میں قدم رکھتے ہی اس نے خود اپنا تعارف کرانے کے بعد نہایت پرتکلف انداز میں ہم سب کو سگریٹ پیش کیے تھے اور پھر باتوں باتوں میں اس قدر بے تکلف ہو گیا کہ ہمیں سفر کے دلچسپ ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

ٹرین بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اُوپر کے برتھوں پر دھرے ہوئے بستر اور سوٹ کیس، کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے ہیٹ، سویٹر اور تولیے جھکولے کھا رہے تھے۔ دو ٹرنکوں کو اُوپر تلے رکھ کر بنائی ہوئی میز بھی لرز رہی تھی اور میز پر بچھا ہوا باتھ روم ٹاول اور اس ٹاول پر اگلی بازی کے لیے پھینٹ کر رکھے ہوئے گلابی رنگ کے پتے، سگریٹ کارٹن، رائیٹنگ پیڈ، پنسل اور لائٹر بھی کانپ رہا تھا۔

"ون نو ٹرمپ"۔ تاش کے تیرہ پتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں بولا۔

"ڈبل"۔ انجنیئر نے روڑا اٹکایا۔

"نو بڈ" میرے ساتھی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"ٹو ہارٹز"۔ سرجن نے پینترا بدلا۔

"نو بڈ"۔ میری ہمت ٹوٹ گئی۔

"فور ہارٹز"۔ انجنیئر نے سب کا منہ بند کر دیا۔

یکایک باہر سے شور وغل سُنائی دیا ٹرین کومیر اسٹیشن پر رُکی۔ ہم سب نے تاش کے پتّے میز پر اوندھے رکھ کر کھڑکیوں میں سے باہر جھانکا۔ نیم برہنہ دیہاتی تھرڈ کلاس کے ڈبّوں میں جلد از جلد گھُس جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ ایک بڈھا، تین چار برقعہ پوش عورتوں کو ہانکتا ہوا پلیٹ فارم پر آگے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اور ان عورتوں کے ہاتھوں میں چھتریاں نقل وحرکت میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھیں۔

اسٹیشن ماسٹر اپنے دفتر کے برآمدے میں کھڑا مسافروں کی احمقانہ حرکتیں دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ پھر دفعتہً شور وغل بند ہو گیا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے دفتر میں چلا گیا اور ہم سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

"بہت خوب!" انجنیئر نے دوسری طرف کھُلتی ہوئی کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم سب کی نگاہیں اُدھر ہی اُٹھ گئیں۔ سامنے خشک اور مٹیالی پہاڑی کی چوٹی پر ریلوے ملازمین کے لیے سینیٹوریم تعمیر ہو رہا تھا۔ بوجھ سے لدے ہوئے مزدور بوجھل قدموں سے پہاڑی کی چوٹی کی طرف چڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"کتنے جفاکش ہیں یہ لوگ" انجنیئر نے پہاڑی پر رینگتی ہوئی زندگیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دفعتہً قریب سے کوئی بچہ رونے لگا۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا۔ ایک خالی ویگن کے پہیّوں کے پاس ایک نیم برہنہ عورت دبکی بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں بچّہ بھوک سے بلبلا رہا تھا۔

ٹرین حرکت کرنے لگی۔

عورت نے بچے کا منہ اپنی خشک چھاتی سے لگایا اور بچہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے زور زور سے رونے لگا۔

کومیرا سے نکل کر ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی میں باہر ہی دیکھتا رہا۔ اس خالی ویگن کی سمت، اس خشک اور مٹیالی پہاڑی کی طرف، دوڑتی ہوئی ہریالی اور شادابی کی جانب۔ اور پھر میں ان مزدوروں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو دھوپ میں اینٹیں بنا رہے تھے۔ ان کے قریب ہی اینٹوں کے بھٹے سے دھواں نکل رہا تھا۔ پھر دوڑتا ہوا سبزہ قریب سے گزر گیا۔ پھر پیڑوں کی چھاؤں تلے بانسوں کے گھر زندگی اجاگر کرنے لگے۔ آنگن سے لے کر تالاب تک بانسوں سے ڈھکے ہوئے راستے جن میں سے رنگ برنگی ساڑھیاں حرکت کرتی نظر آ رہی تھی۔ ایک کھڑکی سے جھانکتی ہوئی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، تالاب میں تیرتا ہوا ہنسوں کا جوڑا۔ دوڑتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر شور مچاتے ہوئے بچے اور پھر وہ بانسوں کے جھنڈ کی چھدری چھدری چھاؤں میں پتھر پر بیٹھا ہوا چرواہا جو بانسری بجا رہا تھا۔ جس کے آس پاس زندگی مسکرا رہی تھی۔ بھاگتی ہوئی ٹرین بانسری کی لے پیچھے چھوڑ آئی تھی مگر نغمے کا تاثر ہمارے ڈبے کے کونے کونے میں گونج رہا تھا۔

"اماں یار پتے باسی ہو جائیں گے۔" میرے پارٹنر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ کھیل پھر شروع ہو گیا۔

میرا پارٹنر برج کے اصولوں سے بخوبی واقف نہ تھا۔ وہ قدم قدم پر مضحکہ خیز غلطیاں کرتا۔ لیکن لطف کی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی ہر غلطی کو عجیب و غریب دلائل سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اس مرتبہ بازی ختم ہو چکنے کے بعد جب بحث و تنقید شروع ہوئی تو اس نے سول سرجن کی رائے کو پھر قہقہوں میں ڈبو دیا۔

"سول سرجن صاحب یہ آپریشن تھیٹر نہیں۔ ریل گاڑی کا ڈبہ ہے۔" پیشتر اس

کے کہ وہ کچھ اور کہتا انجنیئر کی ضبط کی ہوئی ہنسی بلند قہقہے میں تبدیل ہو گئی اور پھر قہقہوں پر قہقہے دوڑتی ہوئی ٹرین کی آوازوں میں تحلیل ہونے لگے۔

"انجنیئر صاحب آپ ہی بتائیے۔" میرا پارٹنر حریف سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر میں نے اینٹ کی بیگم غلط ڈسکارڈ کر دی تو اس میں کون سی بری بات ہے؟ آخر اینٹ کی بیگم کا اعتبار ہی کیا؟" اس دفعہ ایک قہقہہ بھی بلند نہ ہوا۔ بلکہ انجنیئر سگار کو دانتوں کی گرفت سے علیحدہ کر کے کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ سول سرجن نے پائپ سلگا لیا اور پھر بھاری بھاری پپوٹوں کو اوپر اٹھا کر سرخ آنکھوں سے دھان کے کھیتوں کی طرف تکنے لگا۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کے تار تیرتے چلے جا رہے تھے، کسان ہاتھوں میں درانتیاں لیے دھان کی فصلیں کاٹ رہے تھے۔

زرخیز دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں مچل رہی تھی۔ کھیتوں کی مینڈوں پر اگی ہوئی گھاس سبزے کا لہریا بناتی ہوئی، ناریل، سپاری اور کھجور کے پیڑوں کے جھنڈ میں گم ہو گئی تھی۔ رفتار آہستہ آہستہ سست ہو گئی۔ پھر سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ دوڑتے دوڑتے قریب آ گئے۔ اور سیتا کنڈ واٹرنگ اسٹیشن پر ٹرین رک گئی۔

میرے پارٹنر نے بیرے کو چائے لانے کا آرڈر دیا۔

این۔ این۔ آن۔ باہر سے آوازیں آئیں اور پھر ڈبے کا دروازہ کھول کر ایک بھکارن اندر آ دھمکی۔ اس کا بدن اس کی لیریاں لگی ساڑھی کی طرح غلیظ تھا۔ وہ این این آن سے زیادہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلائے انجنیئر

کی طرف سرکتی جا رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک کالا کلوٹا برہنہ بچہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں شاید ایک نئی زندگی سیتا گنڈ کے بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کیلیے بے قرار ہو رہی تھی۔ انجنیئر نے بٹوے سے ایک اٹھنی نکال کر بھکارن کی طرف پھینک دی۔ اٹھنی مٹھی میں داب کر ایں ایں کرتی ہوئی وہ ہمارے ڈبے سے باہر نکل گئی۔

"اینٹ کی بیگم"! میرے پارٹنر نے گہری سانس لے کر کہا۔

بیرا چائے لے کر آ گیا۔

"انجنیئر صاحب! آپ کو اس ملک میں آئے کتنا عرصہ ہوا ہے"۔ میرے پارٹنر نے چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے گفتگو چھیڑی۔

"میں دوسری جنگِ عظیم میں یہاں آیا تھا"۔ انجنیئر نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اس وقت انڈین میڈیکل سروس میں تھا"۔ سول سرجن نے پیالیوں میں دودھ ٹپکاتے ہوئے کہا۔

"اور ان دنوں میں نے پہلی بار خودکشی کی تھی"۔ میرے پارٹنر نے پیالی میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"خودکشی!" ہم سب اس کا منہ تکنے لگے۔

"ہاں خودکشی"۔ میرے پارٹنر نے چائے کی چسکی لے کر پیالی طشتری میں رکھ دی۔

یکایک ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر کسی دوسرے گاؤں کو جانے والے براتی ویٹنگ روم کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ کہاروں نے

پالکی برآمدے میں رکھ دی۔ دبلا پتلا دولھا کھانستا ہوا پالکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ سرخ ساڑھی کا زرّیں آنچل پالکی کے دروازے کے بیچ سے نکل کر ہوا میں لہرا رہا تھا۔ لانبی لانبی گندمی انگلیاں پالکی کے دروازے کو تھامے ہوئے تھیں۔ بھری بھری کلائی میں سونے کی دو چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

"غلط ڈِسکارڈ۔ اینٹ کی بیگم۔" میرے پارٹنر نے پالکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پلیٹ فارم پر خوانچے والے چلّا چلّا کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ دو کمسن چھوکرے نظریں نیچی کیے پالکی کے سامنے ٹہل رہے تھے۔

معاً گاڑی کو ہلکا سا دھکا لگا۔ طشتری میں پڑی ہوئی پرچ پیالیوں میں کھنکھناہٹ ہوئی۔ انجن پانی لے کر واپس آ گیا تھا۔

بھکارن دولھا کے سامنے ہاتھ پھیلائے ایں ایں کر رہی تھی۔ سرخ ساڑھی کا زرّیں آنچل ابھی تک نظر آ رہا تھا مگر لانبی لانبی گندمی انگلیاں غائب ہو چکی تھیں۔

بیرا پرچ پیالیاں اور پیسے لے کر چلا گیا۔

ٹرین چل پڑی۔

دائیں جانب سیتا کنڈ کی اونچی پہاڑی پر چندر ناتھ کا مندر نظر آ رہا تھا۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگیں۔ حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ تیرتا چلا جا رہا تھا۔

نیلے آسمان میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے بھی بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ ٹرین گورنمنٹ پولٹری فارم کے قریب سے گزری تو مرغیوں کے ڈربے ایک ہی جھٹکے میں چکر کھا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ مہادیو پور سے نکل کر گاڑی کی رفتار

تیز ہوگئی۔

"ہاں تو اُن دنوں آپ نے پہلی بار خودکشی کی تھی"۔ انجنیئر نے میرے پارٹنر سے مخاطب ہو کر کہا۔

سول سرجن میرے پارٹنر کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور میرا پارٹنر ہاتھ میں اینٹ کی بیگم لیے خاموش بیٹھا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔

"خودکشی سے میری مراد شادی ہے"۔ میرے پارٹنر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اینٹ کی بیگم پتوں میں ملا کر تاش پھینٹنے لگا۔ یہ سن کر ہم سب ہنس دیئے۔ یونہی ایک پھیکی سی غیر فطری سی ہنسی، جیسے سامعین کوئی لطیفہ نہ سمجھتے ہوئے بھی بدذوقی کے الزام سے ڈر کر یونہی ہنس پڑیں۔

"آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں"۔ انجنیئر نے نئے سگار میں دیا سلائی سے سوراخ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن خودکشی ہی میں تو زندگی ہے"۔ سول سرجن سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"بجا فرماتے ہیں آپ چونکہ شادی کے بعد زندگی کا مسلسل پوسٹ مارٹم ہوتا رہتا"۔ میرے پارٹنر نے یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا اور پھر ہم سب نے اس کی تقلید کی۔

انجنیئر سگار کو دانتوں کی گرفت سے علیحدہ کر کے بولا۔

"اگر اس دنیا میں عورت نہ ہوتی ...."

"یعنی اینٹ کی بیگم"۔ میرے پارٹنر نے انجنیئر کی بات کاٹ کر کہا۔

لیکن اس مرتبہ کوئی قہقہہ بلند نہ ہوا۔ کسی کے ہنسنے کی آواز نہ آئی کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نمودار نہ ہوئی۔

انجنیئر پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے ادھ جلے سگار کو احتراماً کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ آہستہ آہستہ اُس کی پلکیں مل گئیں، جیسے وہ اونگھ رہا ہو، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو

"مجھے افسوس ہے انجنیئر صاحب، میں نے بغیر سوچے سمجھے آپ کی بات کاٹ دی۔" میرے پارٹنر نے اظہارِ تاسف کیا۔

"افسوس کی کوئی بات نہیں۔ اسے مرنا تھا سو وہ مر گئی۔" انجنیئر نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔

شاید میری طرح ہر ایک انجنیئر کے منہ سے کچھ اور سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آناً فاناً فضا ہی بدل گئی تھی۔ اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم چاروں مسافر ابتدائے آفرینش سے دوڑتی ہوئی ٹرین میں سفر کر رہے ہوں۔ اپنی اپنی منزل کی طرف جا رہے ہوں۔ اتنے قریب بیٹھے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے سے کس قدر دُور تھے۔ اپنی اپنی دنیائیں سینوں میں دبائے، زندگی کی گمبھیرتا میں انفرادی یادوں کی دھنک ٹانکے ہوئے ہم اپنی اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ باہر کھیتوں میں کسان گنّے کا رس پکا کر گُڑ تیار کر رہے تھے۔ پگڈنڈی پر ایک دیہاتن چلتے چلتے رُک کر دوڑتی ہوئی ٹرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر پر گھاس سے بھری ہوئی ٹوکری تھی اور ہاتھ میں کھرپا۔ اس کی شکل و صورت رضیہ سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ وہی رضیہ جو میرے گاؤں میں رہتی تھی۔ جو دھان کی پنیری لگاتے ہوئے اور درانتی سے فصل کاٹتے ہوئے رس بھرے گیت گایا کرتی تھی۔ جو مجھے

دیکھ کر اکثر اُداس ہو جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر میں قوسِ قزح کی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے لاکھوں موتی ٹپک ٹپک کر دھرتی کے سینے میں جذب ہو گئے تھے جو ایک دن چپ چاپ پالکی میں بیٹھ کر دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اور میں بڑے چاؤ سے ایک دوسری رضیہ کو شہر سے لے آیا تھا۔ جس کے ہاتھ درانتی کے بجائے پیانو سے آشنا تھے۔ جسے پا کر میں پہلی رضیہ کے گاؤں کی جانب دیکھتے ہوئے آنسو بہایا کرتا تھا۔

"یہ دنیا بھی عجیب ہے۔" سول سرجن نے بھاری بھاری پپوٹوں کو سرخ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں شاعر نہیں ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ خودکشی ہی میں تو زندگی ہے۔ میں نے ایک حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ زندگی کا ایک انوکھا واقعہ دہرایا تھا۔"

انجنیئر نے آنکھیں کھول لیں۔ میرے پارٹنر نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ ہم سب نہایت دلچسپی سے سول سرجن کی باتیں سننے لگے۔

"برسوں پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کی لاش میرے پاس لائی گئی۔" سول سرجن نے قصہ سنانا شروع کیا۔

"لڑکی نے زہر کھا لیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا تھا کہ وہ مر گئی ہے لیکن دراصل وہ زندہ تھی۔ میں گھنٹوں کی محنت کے بعد اس کے معدے سے زہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ لڑکی نہایت حسین و جمیل تھی۔ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بڑی نحیف آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "مجھے مرنے کیوں نہیں دیا۔"

"اس لیے کہ تمھیں زندہ رہنا ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

یہ سن کر وہ رونے لگی۔

"اب وہ میری بیوی ہے اور چار خوبصورت بچّوں کی ماں۔"

پیشتر اس کے کہ ہم اس غیر معمولی واقعہ پر مزید گفتگو کر سکتے انجینیئر دفعتاً بول اٹھا۔ "لیکن ہیلن کو میں گھر میں پیانو بجاتا چھوڑ کر کام پر گیا تھا۔ شام کو واپس آ کر دیکھا کہ ہیلن نے اپنی بچّی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ اور خود پوٹاشیم سائنائڈ چکھ کر ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

"میٹھے تربوز، میٹھے تربوز۔"

ٹرین میرسرائے اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ مخالف سمت سے آئی ہوئی ٹرین دوسری پٹری پر کھڑی تھی۔ دونوں ٹرینوں کے درمیان تربوز بیچنے والا "میٹھے تربوز، میٹھے تربوز" کی رٹ لگا رہا تھا۔ دوسری جانب پلیٹ فارم کے خاتمے پر مہاوت کی مخصوص آواز میں سن کر ہاتھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کے ہودے میں نارنجی ساڑھی پہنے ایک نئی نویلی دلہن اپنے دولھا کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاتھی پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔ بینگن، کریلا اور مرچوں سے بھری ہوئی ٹوکری سر پر اٹھائے ہوئے سیاہ فام مزدور چلتے چلتے رک گیا۔ جیسے پلیٹ فارم پر قدم اٹھانا بھول گیا ہو۔

ٹرین چل پڑی اور چند لمحوں میں دھوم گھاٹ کے اس پار پہنچ گئی۔ جوارگنج پہنچتے پہنچتے آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ فاضل پور کے قریب جھکڑ چلنے لگا۔ درخت جھومنے لگے۔ چرواہے ریوڑوں کو ہانکتے ہوئے چراگاہوں سے

لوٹ آئے۔ ہم سب خاموش تھے۔ شاید میری طرح دوسروں کی آنکھوں کے سامنے بھی ایک ہیلن بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بچی کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ پھر وہ پوٹاشیم سائنائڈ کی شیشی ہاتھ میں لیے کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ فینی سے نکل کر جھگڑا ختم گیا۔ فضائیں خاموش ہو گئیں۔

"انجنیئر صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر اس المناک حادثے کی وجہ کیا تھی؟"

"ہیلن مجھ سے زیادہ پیانو سے پیار کرتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت نئے سُر نکالنے میں صرف کرتی تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ صرف مجھ سے پیار کرے وہ اپنی بچّی کو بھی پیانو سکھاتی تھی لیکن میری تمنّا تھی کہ میری بچی بڑی ہو کر ڈاکٹر بنے۔ انہی باتوں پر دن رات جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔"

"ٹکٹ پلیز۔" ہمارے سامنے ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔

ٹرین کسی اسٹیشن پر رُک گئی تھی۔ انجنیئر نے نیا سگار سُلگا لیا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے اُڑ اُڑ کر کھڑکیوں سے باہر نکل رہے تھے۔ سول سرجن بھاری بھاری پپوٹوں کو اوپر اٹھائے سرخ آنکھوں سے انجنیئر کے چہرے کی لکیروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا پارٹنر اینٹ کی بیگم ہاتھ میں لیے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اُترن

سولہ برس پہلے بھی اسی طرح جاڑے کے دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوتی تھیں۔ لیکن اُن دنوں جب سردی پڑتی تو کشور بے حد خوش ہوتی تھی۔ اس لیے کہ اُسی موسم میں تو کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا لطف تھا۔ گلابی جاڑے میں اُس کی سسرالی حویلی میں خوب گہما گہمی رہتی۔ بڑے اہتمام سے جڑاول تیار کی جاتی۔ ادھر دُلائی سِل رہی ہے۔ اُدھر رضائی میں ڈورے ڈالے جا رہے ہیں۔ بزاز طرح طرح کی فردیں لے کر حویلی کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ رنگ اور آوازیں مختلف زاویوں سے اُبھر کر حواسِ ظاہری کو پُر بہار کر دیتیں۔ جب مہاوٹ میں جاڑا چمکتا تو کشور اپنا گرم جوڑا اُتار کر کسی مسکین عورت کو دے دیتی۔ ایسا کرتے ہوئے، اُسے عجیب مسرت کا احساس ہوتا۔ جیسے اُس نے کچھ دے کر بہت کچھ پا لیا ہو۔ جیسے اُس کے نرم و نازک ہاتھوں نے کسی کُٹیا کی طرف بڑھتی ہوئی سرد ہواؤں کو روک دیا ہو۔ اُس کا یہ سلوک خاندانی روایات کے عین مطابق تھا۔ اُس کی ماں اور خوشدامن کے ہاتھ بھی اُسی طرح سرد ہواؤں کو روکا

کرتے تھے۔

لیکن واردات کے ایک ہی دھچکے نے اُسے سسرالی حویلی سے نکال کر میلوں دُور پھینک دیا اور جب وہ سفیدہ آم، گولچا پان، چکنی ڈلی اور سفید الائچی کی دُنیا سے نکل کر پُرانی انارکلی میں پہنچی تو اُسے شہزادہ سلیم کی انارکلی یاد آنے لگی۔ کہتے ہیں، بچاری کو سرو قد کھڑا کر کے دیوار میں چن دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں کشور بھی اپنے آپ کو انارکلی سمجھنے لگی۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی تو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ پُرانی انارکلی میں بسنے سے پہلے وہ آنچل پھیلا پھیلا کر دعا کیا کرتی تھی کہ کہ خدا اُس کی گود ہری کرے۔ لیکن اب تو جیسے اولاد کے تصوّر سے اس کا جی کھٹّا ہو گیا تھا۔ اُس چھوٹی سی کوٹھری میں میاں بیوی کا ہی گزارا بہ مشکل ہو رہا تھا۔ کوٹھری کی دیواروں پر سیلن نے ڈراؤنی شکلیں بنا رکھی تھیں۔ کہیں کہیں سے پلستر اُکھڑا ہوا تھا۔ اور چھت برسات میں انارکلی کی طرح آنسو بہاتی تھی۔ کوٹھری کی چھوٹی سی کھڑکی ایک میدان کی جانب کُھلتی تھی۔ میدان کے چار مالک تھے۔ وہاں عمارتیں تعمیر ہونے والی تھیں۔ نقشے پاس ہو چکے تھے۔ بس آج کل میں کام شروع ہونے والا تھا۔ لیکن یہ قصّہ تو وہ ایک عرصے سے سُن رہی تھی۔ گوالوں نے وقتی طور پر اُس میدان میں چھپّر ڈال رکھے تھے۔ وہاں ناندیں بنی ہوئی تھیں۔ بھُوسے کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہاں بھینسیں ڈکراتی تھیں، چھینکے لگی تھوتھنیوں والی کٹیاں اور کٹڑے کلیلیں بھرتے تھے۔ یہ عارضی بندوبست برسوں سے چل رہا تھا۔

ہر صبح دودھ دوہنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ گوالوں کی لٹھ مار گفتگو کشور اور رانجھے کو بیدار کر دیتی۔ کشور کے خاوند کا اصلی نام تو شاعرانہ سا تھا لیکن

پرانی انار کلی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد خاوند نے خواہش ظاہر کی تھی کہ رفیقۂ حیات اُسے رانجھا کہہ کر پکارے۔ میاں بیوی ایک مدت سے وارث شاہ کی ہیر سُن رہے تھے۔ ہر شب گوالوں کی محفل جمتی۔ اُن میں سے ایک ہیر کے بول، ایک مخصوص لے میں سناتا۔ اُس کے سینے میں بے پناہ دم تھا اور آواز میں سوز۔ ایک صوتی وقار بڑے خلوص سے بلند ہو کر پرانی انار کلی کے کونے کونے پر چھا جاتا۔ پہلے روز ہیر کے بول سُن کر کشور کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اُس دن ہر مصرعے کے الفاظ دھم دھم کرتے اِدھر کھڑکی میں سے داخل ہوتے تھے اور دھائیں دھائیں کرتے اُدھر نکل گئے تھے۔ کشور اور رانجھا حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ہیر کے بول ایک دلکش نغمے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ کشور اور رانجھا وارث شاہ کی ہیر انتہائی شوق سے سنتے۔ ایسے میں دل دھک دھک کرنے لگتے، راوی کی لہریں تیز بل کھانے لگتیں اور سفید الائچی کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی۔

رانجھے کا خیال تھا کہ اُس کا نیا نام رومان پرور ہے۔ کیونکہ آج کل کی تیز رفتار دنیا میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو رانجھا محسوس کرنا اور ماضی کو بھول جانا بھی غنیمت ہے! اور ہیر رانجھے کا قصہ پڑھنے والے پڑوسی گوالے، تڑکے تڑکے، خالص دودھ اُس کے گھر پہنچا دیتے تھے۔ اُس دودھ کی چائے بڑی خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ رانجھا وہ چائے پی کر تیز دوڑتی ہوئی دُنیا سے بھی زیادہ تیز اپنی سائیکل کے گھِسے ہوئے پیڈل گھماتا دفتر کی طرف نکل جاتا۔ کشور کھڑکی کے پٹ کھول دیتی۔ آفتاب کی ترچھی ترچھی شعاعیں چپکے سے اندر آ کر مسکرانے لگتیں۔ کھڑکی سے لے کر فرش پر

بنی ہوئی چھوٹی سی روشن مستقبل تک متحرک ذرّے نمایاں ہو جاتے۔ کشور دعا مانگتی کہ ساتھ کے میدان کے چاروں مالکوں کو خدا چھپّر پھاڑ کر دولت دے تاکہ وہ جلد از جلد عمارتیں کھڑی کر سکیں۔

سولہ برس پہلے بھی اسی طرح جاڑے کے دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوتی تھیں۔ گلابی جاڑا کب کا گزر چکا تھا۔ اب تو سردی کا یہ عالم تھا کہ حلوے میں روا پڑنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ کشور کو احساس ہونے لگا تھا کہ اب اُسے پہلے سے زیادہ سردی لگتی ہے۔ خصوصاً شام کے وقت جب وہ رانجھے کے ہمراہ چہل قدمی کے لیے باہر جاتی۔ دن بھر کی اُداس تنہائی میں اُس کا جی گھبرا جاتا تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے کوٹھری میں رات ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے آنگن میں پلنگڑی پر بیٹھ کر کنگھی چوٹی کرتی۔ رانجھا لوٹ کر آتا تو وہ خالص دودھ کی چائے تیار کرتی۔ چائے پی کر دونوں میاں بیوی گھومنے کے لیے باہر چلے جاتے۔ کشور کھلی فضا اور تازہ ہوا کو اُتنا ہی پسند کرتی تھی جتنا رانجھا اُس کے جذبات کا احترام کرتا۔ وہ اپنی بیوی کی خاموش گفتگو کو سمجھتا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ کو پہچانتا تھا۔ اُس کے ابرو کے ہر خم کی ترجمانی کر سکتا تھا۔ قربت اُس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ کشور کے ہونٹ ملنے سے پہلے وہ اُس کے دل کی بات کہہ دیتا تھا۔ لیکن چند دنوں سے کشور من ہی من میں کُڑھتی رہتی تھی۔ اُس کا گرم کوٹ بوسیدہ اور پہننے کے قابل نہ رہا تھا۔ شام کے وقت چہل قدمی کرتے ہوئے وہ سردی سے کانپ کانپ جاتی۔ دو ایک بار تو ایسا ہوا کہ اُس نے اپنے شانے سکیڑ کر دانتوں کی کٹکٹاہٹ پر بمشکل قابو پایا۔

اُس نے اپنی پڑوسن کے گرم کوٹ کی تعریف بھی کی - لیکن رانجھے کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی - اُس کے ہونٹوں نے کوئی جنبش نہ کی - ہر مرتبہ، خلافِ توقع، اُس نے موضوع کا رُخ بدل دیا - کشور کو اپنے گھریلو حالات کا احساس تھا - وہ جانتی تھی کہ گرم کوٹ خریدنا اُن کے بس کی بات نہیں "چلو اگلے جاڑوں میں سہی" وہ دل ہی دل میں کہہ کر اپنے آپ کو تسلّی دیتی - لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کے جسم کی ہر کپکپاہٹ برچھی بن کر رانجھے کے دل میں پیوست ہو گئی ہے - اُس نے کتنی مرتبہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے ہیں - اُس نے کتنی بار کسی سے قرض مانگنے کا ارادہ کیا اور پھر کچھ سوچ کر ترک کر دیا -

رانجھا اکثر نئی انارکلی سے گزرتا اور ہزاروں باتیں سوچتا - وہاں گرم کپڑے اور اُون کی دُکانوں میں بلا کی چہل پہل رہتی تھی - سڑک پر ہجوم کا یہ عالم کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا - اُسے یوں معلوم ہوتا اس مُلک میں بے پناہ دولت ہے - یہاں گرم کپڑے، اُون اور کاسمیٹکس کی فراوانی ہے - وہ سوچتا آخر انسان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے - اگر رواروی کی زندگی میں مطالعہ کا وقت نہ مل سکے تو کم از کم شاندار میک اَپ ہی کر لینا چاہیے - بلیرڈ، برج یا پوکر ہی کھیل لینا چاہیئے - پھر یکایک نئی انارکلی کے موڑ پر پہنچ کر اُس کے خیالات کروٹ بدلتے - وہ ہر موڑ پر رُک کر سوچنے کا عادی تھا - انارکلی بازار میں اُس نے کسی چہرے پر مسکراہٹ نہ دیکھی تھی - یہاں سے وہاں تک سنجیدہ، اُداس، متفکّر چہرے نظر آتے تھے اور تب اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سب لوگ کوٗک بھرے ہوئے کھلونے ہیں - جو گرم کپڑے خرید کر اپنے جسموں کو ڈھانپتے ہیں اور اپنی سوچ کو صندوقچی میں بند کر کے

اِدھر اُدھر ڈانواں ڈول پھرتے ہیں۔ دھرتی سے اُگا ہوا اناج کھاتے ہیں اور پھر ایک دن میانی صاحب کے قبرستان میں آرام سے سو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بھی چلتی پھرتی لاش ہے جس کی بُو نئی انارکلی کے موڑ سے لے کر سفیدہ آم اور چکنی ڈلی کی دُنیا تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ بُو پہاڑ کی فلک بوس چوٹیوں، سمندروں، دریاؤں، آبناؤں اور خلیجوں کو چھُوتی ہوئی کہاں سے کہاں نکل گئی ہے اور نئی انارکلی کی دُکانوں کے شوکیسوں میں سجے ہوئے زنانہ گرم کوٹ آگ کے شعلے ہیں جن کو چھُونے سے اُس کے ہاتھ جل کر راکھ ہو جائیں گے۔

کشور اکثر سوچتی کہ اُس کا خاوند رانجھا بن کر اپنے ماضی کو بھُول گیا ہے۔ لیکن اُسے بیتے دنوں کی ایک ایک بات یاد تھی۔ اُسے یوں معلوم ہوتا جیسے گزرا ہوا ہر واقعہ کل کی بات ہے۔ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تو آن کی آن میں حال کے ڈانڈے ماضی سے جا ملتے۔ ابھی کل کی بات تھی کہ وہ دُلہن بن کر اپنی سسرالی حویلی میں آئی۔ اُس وقت چاندنی، دھوپ اور جاڑے کی چمک میں بھرپور زندگی تھی اور اُس بھرپور زندگی کی رونق میں اُس کے شوہر نے اُسے بے شمار تحفے دیے تھے۔ وہ سوچتی تحفہ مقصود بالذات نہیں۔ تحفہ ایک شے ہے اور ہر شے مٹ جاتی ہے۔ لیکن تحفے کو پیش کرنے والے جذبات کی مقدس دنیا غیر فانی ہے اور ایسی دُنیائیں تو اُس کی یاد کے ہر گوشے میں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ اُن انمول خزانوں کے سہارے وہ جی سکتی تھی۔ اُس چھوٹی سی کوٹھری میں بھی خوش رہ سکتی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی مسکرا سکتی تھی۔ لیکن ایک دن

تحفہ پاکر مسکرانے کے بجائے اُس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

اُس دن رانجھا دفتر سے جلدی لوٹ آیا۔ کشور آنگن میں پلنگڑی پر بیٹھی چھالیا کتر رہی تھی۔ رانجھے نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" کشور نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"رانجھا" جواب ملا۔

کشور نے لپک کر دروازہ کھولا۔

رانجھا دہلیز پر کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس کے پُرانے کوٹ کے کاج میں گلاب کا تازہ پھول ہنس رہا تھا۔ وہ سینہ تان کر ایک فاتح کی طرح کھڑا تھا۔

"تشریف لائیے" کشور بولی۔

رانجھا آنگن میں بچھی ہوئی پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔

"آج آپ جلدی لوٹ آئے ہیں"

"ایک ضروری کام تھا۔

"چائے بناؤں"

"ابھی نہیں"

ڈھلتے سورج کی کرنیں مشرقی دیوار کو چھو رہی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ "کل پھر ہمارا ملاپ ہوگا۔ ہم اسی طرح ملتے اور بچھڑتے رہیں گے" زرد چونچوں والی گٹاریں منڈیر کے ایک کونے سے اُڑ کر دوسرے کونے پر جا بیٹھیں۔ لمحہ بہ لمحہ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ چولھے کے پاس پانی

سے بھری کیتلی جوں کی توں پڑی تھی۔ رانجھا وقت سے پہلے لوٹ آیا تھا۔ کشور نے ابھی کنگھی چوٹی نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود وہ رانجھے کو نہایت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ رانجھا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو ـــــ اُس کی مسکراہٹ آناً فاناً گُم اور آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ کشور منہ سے نہ بولی۔ لیکن دل میں وہ بھی کچھ سوچنے لگی۔ رانجھے نے سورج کی بچھڑتی ہوئی شعاعوں کی طرف دیکھا اور پھر جھٹ ایک کنکرے کر چھت کی طرف پھینک دیا۔ زرد زرد چونچوں والی گٹاریں پھر سے اُڑ گئیں۔ رانجھا اور کشور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رانجھے نے پھر سینہ تان لیا۔ مسکراہٹ عود کر آئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ جیسے اُس نے کوئی تصفیہ کر لیا ہو۔

"کشور"! رانجھا جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"دروازے کی اوٹ میں کوئی چیز تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

کشور نے اُٹھ کر دروازے کے پٹ کے پیچھے دیکھا، ایک بنڈل، خاکی کاغذ میں پٹا سُتلی سے بندھا رکھا تھا۔ کشور بنڈل ہاتھ میں لیے لوٹ کر آئی اور رانجھے کے پاس پلنگڑی پر بیٹھ گئی۔

"کھولو۔" رانجھا بولا۔

کشور نے اُٹھ کر کارنس سے چاقو لیا۔ پلنگڑی پر بیٹھ کر سُتلی کو کاٹا۔ ایک سرخ رنگ کا گرم کوٹ کھسک کر کشور کے گھٹنوں پر جا پڑا۔ کشور کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔ جذبات کے ہجوم میں اُس کے حساس ہونٹ لرزنے لگے۔

"پہنو تو!"

کشورؔ نے اُٹھ کر کوٹ پہنا۔ کوٹ کی تراش نہایت خوب صورت تھی۔ گھیرا متناسب، کمر کی چُنٹیں موزوں، گریبان کی لوٹ پر سُتھرا انجیا، سینے پر بسنتی کڑھت کی پھبن۔ وہ کوٹ پہن کر تو کشورؔ پانچ سال پیچھے چلی گئی۔ آنگن میں چاند نکل آیا۔ اُس شام جب وہ رانجھے کے ہمراہ چہل قدمی کے لیے باہر گئی تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُسے آسودگی پہنچانے لگے۔ ایک ٹھٹھرتی ہوئی بھکارن کو دیکھ کر اُسے بہت ترس آیا۔ اُس کا دایاں ہاتھ پھسل کر کوٹ کی جیب میں چلا گیا۔ اُس نے کھٹ سے چونّی نکال کر بھکارن کی کٹوری میں ڈال دی۔ بھکارن نے بآوازِ بلند جوڑے کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ کشورؔ جاڑے کی تمام پچھلی کوفت بھول گئی۔ اُسے اپنے خاوند سے یہ دریافت کرنا بھی یاد نہ رہا کہ کوٹ خریدنے کے لیے اُس نے روپے کہاں سے حاصل کیے۔ اس کُرید کو مستقبل کے خانے میں رکھ کر وہ حال کی آسودگی اور گرمی میں سانس لیتی، اپنے رانجھے کے شانے سے شانہ ملا کر چلنے لگی۔ اُس نے گھر پہنچ کر توے پر پھُلکے پکائے اور پھر اُنھیں انگاروں پر سینک کر پھُلایا۔ ماش کی کھڑی دال نے دُونا لطف دیا۔ ہیر کے بول سینے میں دبی ہوئی آرزوؤں کو جھنجھوڑنے لگے۔ کھڑکی میں سے چاند نظر آ رہا تھا۔ کشورؔ نے محسوس کیا کہ سرما کی چاندنی ہمیشہ اُداس نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اُس چاندنی میں لمحات کے قافلے پلٹ کر تیزی سے پھر نیا سفر شروع کر دیتے ہیں۔

اگلے روز، شام کے وقت، رانجھے کے ساتھ چلتے چلتے کشورؔ دفعتاً رُک گئی۔ فٹ پاتھ کے کنارے، لوہے کے کٹہرے پر، مردانہ اور زنانہ کوٹوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ زنانہ کوٹ اُس کے اپنے کوٹ سے ہُوبہو ملتے تھے۔ وہی سرخ رنگ،

وہی تراش، کمر کی چُنّٹوں کا وہی انداز، گریبان کی لوٹ پر ستھرا بخیا اور سینے پر بسنتی کڑھت کی پھبن۔

کباڑیا، راہ چلتوں کو اچھے اور سستے مال کی طرف متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

"ولائتی مال!"

"خوب صورت کوٹ۔"

"واجبی دام۔"

"رانجھا!" کشور بولی، "یہ کوٹ جو میں نے پہن رکھا ہے....."

"تم ٹھیک سوچ رہی ہو کشور۔" رانجھا اُس کی بات کاٹ کر بولا "یہ کوٹ میں نے یہیں سے خریدا ہے۔"

رانجھا اس طرح بولا جیسے وہ منوں بوجھ اپنے کندھوں پر لادے ڈگمگا رہا تھا اور پہلا موقع پاتے ہی اُس نے سارا بوجھ دھڑام سے اُتار پھینکا ہو۔

"اُترن!" کشور خشمگیں لہجے میں بولی۔

اُس کی آواز وقت کے دریچے سے نکل کر ماضی کی پگڈنڈیوں پر اِنگارے بکھیرنے لگی۔

"کشور! اس کا استر نیا ہے۔ اسے رفو تک نہیں کیا گیا۔ یہ ڈرائی کلین بھی ہو چکا ہے۔"

کشور کی نگاہیں ایک سوالیہ نشان بن گئیں اور وہ سوالیہ نشان اُس کی سُسرالی حویلی کے در و دیوار کو ہلانے لگا۔ اُس کے خیالات دم کے دم میں وہاں

جا پہنچے جہاں وہ مہاوٹ میں اپنا گرم جوڑا اتار کر کسی مسکین عورت کو دے دیتی تھی اور ایسا کرتے وقت اُسے عجیب مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے اُس نے کچھ دے کر بہت کچھ پا لیا ہو۔ آج اُسے یوں لگا جیسے اُس نے کچھ پا کر بہت کچھ کھو دیا ہو۔ وہ سُرخ رنگ کا کوٹ ایک بھٹی بن گیا۔ اُس کا انگ انگ جلنے لگا۔ رخساروں میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ لپکتے شعلے کانوں کی لویں چاٹنے لگے۔ اُس نے کسی مردہ میم کے جسم سے اُتارا ہوا کوٹ پہن رکھا ہے۔ یہ تصوّر ایک بگولہ بن کر لوہے کے کٹہرے پر ناچنے لگا۔

کشور نے کوٹ اُتار کر رانجھے کے شانے پر رکھ دیا۔ دونوں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔

رانجھے کا دل بولا۔ "کشور میں جانتا ہوں یہ اُترن ہے۔ لیکن یہاں کونسی چیز ہے جو اُترن نہیں۔ یہ آس پاس کی رونق، وہ انارکلی کی چہل پہل، ہماری اپنی نہیں، یہ سب اُترن ہے۔"

مارے سردی کے کشور کے دانت کٹکٹانے لگے۔ ناک کی پھُنگی یخ ہو گئی۔ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اُس نے اپنے شانے سکیڑ لیے۔

سڑک کے کنارے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ لوہے کے کٹہرے کے پاس دو عورتیں سُرخ رنگ کے ایک کوٹ کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

فٹ پاتھ کے موڑ پر پہنچ کر رانجھا رُک گیا۔ ہر موڑ پر رُک کر سوچنے کی اُسے عادت تھی۔ اُسے پھر اپنے جسم سے گلے سڑے گوشت کی بو آنے لگی۔ اُس نے سرخ کوٹ شانے پر سے ہٹا کر ہاتھ میں لے لیا۔ اُسے یوں لگا جیسے دہکتے انگارے

اُس کی اُنگلیوں کی گرفت میں آ گئے ہوں۔ اُس نے نفرت سے دانت بھینچ لیے، سُرخ کوٹ فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ کشور کی سینڈل زرد رنگ کی کرطت کو ٹھکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ عجیب وقار سے قدم بہ قدم چلنے لگی، بالکل جیسے سولہ برس پہلے وہ بن سنور کر اپنے شوہر کے ساتھ باغیچے میں ٹہلا کرتی تھی۔ قدموں کی آہٹ اور غرارے دار پاجامے کی سرسراہٹ خالی لمحات کو پُر کرتی رہی۔ پُرانی انار کلی کی ایک گلی میں پہنچ کر وہ رُک گئے۔ رانجھے نے اپنے گھر کے دروازے میں پڑے ہوئے تالے میں چابی گھمائی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ وقت کے دل میں چابی ڈال کر بائیں سے دائیں طرف گھما رہا ہو اور زمان و مکان کے دائرے تیزی سے چکّر کاٹ رہے ہوں۔

اُس رات گوالوں کی محفل نہ جمی۔ کسی نے ہیر نہ سُنائی۔ اُنھیں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ ایک بھینس کا خوبصورت کٹرا مر گیا تھا۔ دو چار دن پہلے کشور نے بھوری بھینس کو کٹرے کا جسم چاٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج رات جب کشور اور رانجھے نے کھڑکی میں سے دیکھا تو بھوری بھینس مغموم آنکھوں سے لالٹین کی روشنی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک گوالا بالٹی ہاتھ میں لیے بھینس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔ گوالوں نے مردہ کٹرے کی کھال اُتار کر اُس میں بھوسا بھر دیا تھا۔ کٹرے کی وہ اُترن بھینس کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ ایک گوالا بڑھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس نے بالٹی دونوں گھٹنوں کے بیچ ٹکا لی اور بھینس کو چمکارتے ہوئے اُس کی تنی ہوئی کھیری پر ہاتھ رکھا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھینس نے اپنی گردن آگے بڑھائی اور پھر کٹرے کی اُترن کو سینگ پر اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔

کچنار

رات بھیگ چکی تھی۔

ملحقہ خواب گاہ میں سرگوشیوں نے چپ سادھ لی تھی۔ چوڑیوں کی جھنکار فضا میں ہلچل مچا کر گم ہو گئی تھی۔ نئی نویلی دلھن کا گنگنانا بند ہو گیا تھا اور دولھا کے دبے دبے قہقہے خاموش۔

بلقیس نے پلنگ سے اٹھ کر آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولی اور پھر وہ قدم گن گن کر رکھتی ہوئی آنگن میں چلی گئی۔

رات بول رہی تھی۔

آنگن میں کچنار کے پیڑ کی شاخیں جھوم رہی تھیں۔ لیموں کے ننھے ننھے سفید پھولوں نے جی کھول کر آس پاس بھینی بھینی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔ چاندنی میں پتوں اور ٹہنیوں کی پرچھائیاں بلقیس کے دل کی طرح کانپ رہی تھی۔

پچھلے سال بھی تو اسی طرح رُت بدلی تھی۔ بوٗٹے بوٗٹے پر جوبن آیا تھا۔ کچنار کی لمبوتری کلیوں نے اپنا سینہ چیر کر گلابی پتیوں کو آب و تاب بخشی تھی۔

کل کی طرح آج بھی بلقیس کچنار کے پھولوں کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتی رہی تھی۔ اُسے اب پتہ چلا تھا کہ اُن پھولوں کے ساتھ اُس کے بیتے دنوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ بہار کی آمد پر اُس کا شوہر، کمال، اکثر کہا کرتا تھا۔ "بلّن بہار آگئی!" اُس کی آنکھوں میں مسرت کی شبنم کانپنے لگتی تھی اور پھر جذبات میں ڈوب کر وہ اپنی باہیں پھیلا دیتا تھا اور بلقیس کے دل نے دو برس تک اُس پھیلے ہوئے پیار کو پہچاننے سے انکار کیا تھا۔ اُس وقت بلقیس کا خیال تھا کہ اُس کا شوہر مسکراہٹوں کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اپنے پرائے سے گھل مل جانا تو اُس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ تو اپنی خلیری اور ممیری بہنوں، سالیوں اور برادری کی دوسری عورتوں سے اُسی طرح مسکرا مسکرا کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا، جس طرح وہ بلّن سے ہمکلام ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر بلقیس اندر ہی اندر کُڑھتی رہتی۔ عورتوں کی قربت تو درکنار، بلقیس کا بس چلتا تو وہ سورج کی ہر اُس کِرن کو چھین کر فنا کر دیتی جو کمال کے جسم کو بے روک ٹوک چھوتی تھی۔ بلقیس کا ایمان تھا کہ نکاح کے بعد وہ اپنے شوہر کی مسکراہٹوں، نگاہوں اور اُس کی مجموعی توجہ کی تنہا حقدار ہے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کمال اپنی ماں سے رازدارانہ انداز میں گفتگو کرتا تو بھی بلقیس کو سخت کوفت ہوتی۔ ان خیالات کے مسلسل پیچ و تاب میں وہ کمال کے ہر دوست کو ڈاکو سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ وقت کا وہ حصّہ جو کمال اپنے دوستوں میں گزارتا تھا، بلقیس کی پونجی تھی اور اپنی پونجی

لُٹتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے تھے۔

کبھی کبھی بلقیس کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کمالؔ سے نفرت کرتی ہو۔ احساسات کے اس جوار بھاٹے میں ازدواجی زندگی کے دو سال بیت گئے۔ اور جب اُس کی خوشدامن کے انتقال کے بعد، کمالؔ، مسکراتے ہوئے، میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے اپنی غیر منقولہ جائداد بلقیس کے نام کر کے اچانک چل بسا تو بلقیس دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اُس نے اپنے سر کے بال نوچ لیے، سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ کبھی کبھی کی نفرت، محبت میں تبدیل ہو گئی۔

وقت کا ہاتھ بلقیس کے گھاؤ سیتا گیا۔ اور پھر وہ ایک چٹان بن کر بیچ ساگر کے کھڑی ہو گئی۔ اُس کی برادری میں نوجوان بیواؤں نے چٹان بن کر ہی تو حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اُسے پورا پورا احساس تھا کہ اُس کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑ رہا ہے۔ اور وہ اُس خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی بیٹیاں بیوہ ہو کر عمر بھر اپنے سرتاج کے نام پر بیٹھی رہیں۔

آج سے چھ ماہ پہلے بلقیس کا سہاگ اُجڑا تھا۔ اِس عرصے میں اُس کے میکے والوں نے حتی الامکان اُس کا ساتھ دیا۔ دس دن پہلے اُس کی ماں آئی تھی اور اُسے پھل کی ٹوکری اور سہاروں کا خزانہ دے کر چلی گئی تھی۔ پھر اُس کا بھائی آیا اور اُسے امرتیوں کا دونا اور ڈھارس کی گھنی چھاؤں دے کر لوٹ گیا۔ آج صبح اُس کی چھوٹی بہن، ثریا، اپنے خاوند کے ساتھ آنکلی تھی۔ کمالؔ کا چالیسواں ہو چکنے کے دو ماہ بعد ثریا کی شادی ہوئی تھی۔ بلقیس نے بھی اُس تقریب میں شرکت کی تھی۔ اُس دن شہنائیوں کی آوازوں میں ماضی کھچ کر دل کے پاس آگیا

تھا۔ بلقیس بظاہر تو مسکراتی رہی لیکن دل کچنار کے گلابی پھولوں کو پکار پکار کر آنسو بہاتا رہا تھا۔

اب ثریّا اور اس کا خاوند ملحقہ خواب گاہ میں سو گئے تھے۔ سرگوشیوں نے چپ سادھ لی تھی۔ چوڑیوں کی جھنکار فضا میں ہل چل مچا کر گم ہو گئی تھی۔ نئی نویلی دلھن کا گٹکنا بند ہو گیا تھا اور دولھا کے دبے دبے قہقہے خاموش۔ بلقیس کچنار کے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ شاخوں اور پتوں کی چلمن میں سے چودھویں کا چاند نظر آ رہا تھا۔ اُسے یاد تھا، ایک ایسی ہی چاندنی رات میں، اُسی پیڑ کے نیچے، کمال نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا۔ "بلّن تم بھی تو چودھویں کا چاند ہو۔" اور کل جب محلّے کی گھر گھسنی، راجو آئی تھی تو دورانِ گفتگو میں اُس نے اسی رنگ میں بیسیوں تشبیہیں بکھیر ڈالی تھیں۔ بلقیس اُن تشبیہوں کو ایک ایک کر کے چُننے لگی۔ کبھی وہ راجو کے کسی شگفتہ فقرے کو سینے سے لگاتی اور اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ کبھی وہ راجو کی کوئی انگارے کی طرح دہکتی ہوئی بات اپنے رخساروں سے چھواتی اور اس کا رُواں رُواں تیز تیز آنچ میں جلنے لگتا۔ نہ جانے کیوں وہ سوچنے لگی کہ اگر ثریّا اپنے شوہر کے ساتھ اُس کے گھر نہ آتی تو اچھا تھا۔

معاً پڑوس سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بلقیس چونک پڑی۔ اُس نے خوفزدہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ چوری کر رہی ہو۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور پھر احتیاط سے چٹخنی چڑھا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

دوسرے دن جب ثریا چلی گئی تو بلقیس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ من ہی من میں نادم بھی ہوئی۔ اُس نے اوپری دل سے بھی ثریا کو ایک آدھ دن اور ٹھہر جانے کو نہ کہا۔ خدا جانے بلقیس کتنی دیر اسی ادھیڑبُن میں لگی رہتی اگر اس وقت راجو نہ آ دھمکتی۔

راجو نے پہلے تو خیر سلّا پوچھی، پھر اُنگلی ناک پر رکھ کر بولی۔ "ہائے بہن! تجھے دیکھتی ہوں تو اپنا رنڈاپا یاد آجاتا ہے۔"

بلقیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جب یُوبی کا ابّا اللہ کو پیارا ہوا تھا تو میں نصیبوں جلی بھی تیری طرح جوان تھی۔ وائے قسمت! کون کون سی مصیبت تھی جو جھیلنا نہ پڑی۔ اِدھر میّت اُٹھی اُدھر مونڈی کاٹے وارثوں نے حق جتانا شروع کردیا۔ کمال کا کوئی وارث ہوتا تو پاؤں ٹِکنے نہ دیتا۔"

"راجو بہن، اپنا اپنا مقدّر۔"

"بلقیس رانی! سچ پوچھو تو اپنا رنڈاپا میاں اکرم کے سہارے کٹا۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ بڑے خدا ترس۔ جب بھی ضرورت پڑتی تھی میں تو سیدھی اُن کے ہاں پہنچ جاتی تھی۔ اللہ والے نے کبھی ماتھے پر بل نہ ڈالا۔"

"ہاں راجو بہن یہ اللہ لوگ نہ ہوں تو دنیا کیسے چلے۔"

"بلقیس رانی! یہ مُوا جوانی کا رنڈاپا تلوار کی دھار پہ چلنا ہے۔ بہن! میری بات کو آنچل میں باندھ لو، کسے ہوئے گوشت پر سلوٹیں پڑنے میں بہت دیر لگتی ہے۔"

دفعتاً کسی نے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ بلقیس نے دروازہ کھولا۔ نوری لینٹرے

گھسیٹتی اندر آ گئی۔ راجو سلام کر کے باہر نکل گئی۔

نوری، بلقیس کے گھر کا کام کاج کرنے دن میں دو وقت آتی تھی۔ اُس نے جھٹ اپنا دوپٹا الگنی پر ڈالا اور پھر آستینیں چڑھا کر آٹا چھاننے لگی۔

بلقیس قدم قدم چلتی ہوئی اُس کمرے میں داخل ہوئی جس میں گزشتہ شب ثریا اور اُس کا خاوند سوئے تھے۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے سامنے سنگار میز کا آئینہ کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کا عکس اپنے مرکز سے ہٹ کر اُس سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے جُھک کر اپنی ساٹن کی شلوار کا پائنچا گھٹنے تک سرکا لیا۔ وہ اپنی سڈول پنڈلی کو غور سے دیکھنے لگی۔ "کَسے ہوئے گوشت پر سلوٹیں پڑنے میں بہت دیر لگتی ہے۔" راجو کے الفاظ بھڑوں کی طرح بھنبھنانے لگے۔ اُسے یوں لگا جیسے پلنگ کے پائے اینٹوں کے فرش میں دھنسے جا رہے ہوں۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر فوراً ہی سنگار میز کے سامنے بے بازو کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جسم کے ترسے ہوئے بالائی حصّے کا گرم گرم عکس خود بلقیس کو سینک دینے لگا۔ وہ لپک کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ نوری آٹے کو لوچ دے رہی تھی۔ بلقیس کا جی چاہا کہ نوری اُسی طرح اس کے پٹھوں کو مُکیاں لگائے تاکہ ایک تناؤ سا جو اُس کی نس نس میں پیدا ہو رہا تھا، دُور ہو جائے۔

بلقیس اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھنے کی نیّت سے پیڑھی پر بیٹھ کر آلو چھیلنے لگی۔

نوری نے ہاتھ دھو کر دوپٹے کے آنچل سے پونچھے اور پھر وہ گوشت

کی سُرخ سُرخ بوٹیاں دیگچی میں ڈال کر پانی سے دھونے لگی۔

بلقیس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھُری، پہلے آہستہ آہستہ اور پھر جلدی جلدی جلدی بھوُرے بھوُرے چھلکے اُتارنے لگی۔ قاشیں بناتے وقت زرد زرد آلوؤں کی نمی بلقیس کی گرم گرم اُنگلیوں کی پوروں اور گھاٹیوں کو ایک ٹھنڈک سی پہنچانے لگی۔

"آپا! آج آپ کی طبیعت ماندی ماندی معلوم ہوتی ہے۔" نورُی نے بلقیس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بلقیس نے چھُری طشتری میں رکھ دی۔

"نورُی، میں بالکل اچھی ہوں۔ مگر یہ بات تُونے پوچھی کیوں؟"

"یونہی آپا۔"

آج بلقیس کو آپا سُن کر ناگوار گزرا۔ اُس نے سوچا۔ "میری عمر تو نورُی سے دو چار سال کم ہی ہو گی۔"

"دیکھو نورُی، آیندہ مجھے آپا کہہ کر نہ پکارنا۔" بلقیس نے گھُرکی دی۔ اور پھر وہ پیڑھی سے اُٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

نورُی نے کام کاج سے فارغ ہو کر بلقیس کے کمرے میں جھانکا اور پھر دروازے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "لو بی بی جی میں چلی۔"

"اِدھر آؤ نورُی۔"

نورُی کمرے میں چلی گئی۔

"ذرا میرے پاؤں داب دینا۔"

نوری پائنتی بیٹھ کر بلقیس کے پاؤں دبانے لگی۔

"نوری، تیرا خیال ٹھیک تھا۔ واقعی آج میری طبیعت کچھ پھیکی پھیکی ہے"

بلقیس نے پلنگ پر چت لیٹے ہوئے کہا۔

"پنج تن پاک کے صدقے خیر ہوگی میری بی بی کی۔ پر اصل تکلیف کیا ہے ذرا سنوں تو" نوری، بلقیس کے پاؤں کا انگوٹھا چٹخاتے ہوئے بولی۔

"میرا جی گھبرا رہا ہے۔" بلقیس نے آہستہ سے کہا۔

نوری سرک کر آگے آگئی اور بلقیس کی پنڈلیاں دبانے لگی۔

"بی بی جی! میری بات مانو تو جونکیں لگوا لو۔" نوری نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں تجویز پیش کی۔

"جونکیں!" بلقیس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بی بی جی، یہ گھبراہٹ فاسد خون کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھے بھی یہ عارضہ ہوا تھا۔ اللہ توکلی اُس دن فضلاں کنجڑن آنکلی۔ وہ جونکیں بھی لگاتی ہے۔ بس ایک مرتبہ پانی کے کیڑوں سے خون چُسوایا، وہ دن اور آج کا دن، سارے دُکھ دور ہوگئے۔"

"نہ بابا، مجھے تو جونکوں سے ڈر لگتا ہے۔" بلقیس، انگلیوں سے کانوں کی لویں چھُو کر بولی۔

"بی بی جی۔ اب آپ اوندھی لیٹ جائیں۔" نوری نے پلنگ کے سیروے پر تلوے ٹیک کر کہا۔ "ذرا پاؤں سے کُولھے دبا دوں۔ ہلکی پھُلکی

ہو جائیں گی۔"

بلقیس منہ کے بل لیٹ گئی۔ نوری کے پاؤں بلقیس کے کولھوں پر آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ، ایک آسودگی سی نس نس کے کھچاؤ کو کم کرنے لگی۔

"اری، تیرا وزن تو چڑیا جتنا ہے۔" بلقیس نے گردن موڑ کر کہا۔

"نہیں بی بی جی۔ یہ بات نہیں۔ پاس پڑوس والیوں کی تو میرے بوجھ تلے چیں بول جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا جسم کرارا ہے۔ میری آنکھوں میں نون، اس بدن پر سوئی چبھو دوں تو ٹیڑھی ہو جائے۔"

یہ سن کر بلقیس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

تاریک رات میں پہلے تو بوندا باندی ہوتی رہی پھر زور سے پانی برسا۔ جاتی ہوئی سردی پھر لوٹ آئی۔ بلقیس نے رضائی اوڑھ کر آنکھیں میچ لیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود اُسے نیند نہ آئی۔ ایک تو بھائیں بھائیں کرتا گھر اور پھر بیٹھے بٹھائے اُسے ایک بپتا آن پڑی تھی۔ کمال کے ایک دُور کے رشتہ دار نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا کہ مرحوم کی غیر منقولہ جائداد کا وہ بھی وارث ہے۔

راجو نے تو چھوٹتے ہی مشورہ دیا تھا۔ "بہن، میری بات مانو تو سیدھی میاں اکرم کے پاس چلی جاؤ۔ بڑے بارسوخ ہیں۔ کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لیں گے۔ یہ باتیں تیرے میرے بس کی نہیں۔ تیرے میکے والے بھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکیں گے۔"

یہ تشویشناک خبر بلقیس کو دن کے وقت ملی تھی۔ اُس نے راجو اور نوری سے بات کی۔ محلے کی لتری نائن کسی کی منگنی کے لڈو دینے آئی تو یہی ذکر چل نکلا۔ بس

پھر کیا تھا پل کے پل میں سارے محلّے میں بات پھیل گئی۔ عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ چاروں طرف سے ہمدردی کے چشمے اُبل پڑے۔ گھگھر عورتیں باتیں اس انداز سے کرتیں جیسے پُرسا دینے آئی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے، ذہنی طور پر، بلقیسؔ کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ میکے سے بھی تو کوئی نہ آیا۔ بلقیسؔ نے سوچا وہاں سے کوئی آ بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ اُس کے میکے میں، جہاں تک خون کے رشتے کا تعلق تھا، لے دے کے ایک بھائی رہ گیا تھا۔ وہ تو صرف کھیتی باڑی کرنا جانتا تھا یا پیتل کی شام والا لٹھ لے کر مردوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ چچیرے بھائی جانی دشمن تھے، اس لیے کہ بابل نے ذات برادری کو ٹھکرا کر اُس کی شادی شہر میں کمائی سے کر دی تھی۔

دوسرے دن بلقیسؔ نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر حالات کا مقابلہ کرے گی۔ اُس کے خاندان میں جوان بیواؤں نے قدم قدم پر جُرأت سے کام لیا تھا۔ جب وقت پڑا تو قبیلے کی ایک بہادر بیٹی نے جان دے کر نسلوں کی لاج رکھ لی تھی۔

بلقیسؔ نے سیاہ رنگ کا بُرقعہ اوڑھا، جارجٹ کا نقاب چہرے پر گرایا اور کلیجہ مضبوط کر کے سیدھی میاں اکرم کے گھر چلی گئی۔

میاں اکرم نے فوراً اندر بلوا لیا۔ وہ تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ شرعی داڑھی، ماتھے پر گٹّا۔ جس دن سے اُن کی نیک بخت گھر والی کا انتقال ہوا تھا، وہ اپنے اُجڑے ہوئے گھر میں بیٹھے عبادت کرتے رہتے تھے۔

بلقیس تخت کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گئی۔
میاں اکرم آنکھیں نیچی کر کے بلقیس کی داستان سننے لگے۔
بلقیس ایک نامحرم سے مخاطب ہوتے ہوئے پہلے تو جھجکی، لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ خود اعتمادی سے باتیں کرنے لگی۔ واقعات کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے، الفاظ پر زور دیتے وقت، اُس کے گورے گورے ہاتھ حرکت کرنے لگے اور یوں کرتے میں اُس نے عادتاً اپنے پاؤں سینڈل سے نکال کر فرش پر رکھ لیے۔
میاں اکرم دھیان سے بلقیس کی باتیں سُن رہے تھے اور ٹکٹکی باندھے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
دفعتاً میاں اکرم کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر فرش پر جا پڑی۔ اُنھوں نے تخت کے کنارے سے جُھک کر تسبیح پر ہاتھ رکھا۔ اُن کے بدلتے ہوئے زاویۂ نگاہ سے بلقیس کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کی نگاہوں کی اچانک یلغار اُس کے پاؤں کی جلد کو چھُوتی ہوئی اُس کی پنڈلی کی ہڈی کے اندر چھپے ہوئے گودے کو جھنجھوڑ رہی ہو۔
بلقیس نے جھٹ سینڈل پہن لی۔
میاں اکرم کے شانے سیدھے ہونے لگے تو بلقیس کو یوں لگا جیسے میاں اکرم کی آنکھیں، اُس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو آناً فاناً سمیٹ کر عینی گہرائیوں میں جذب کر لینا چاہتی ہوں۔
بلقیس نے اپنے ہاتھ بُرقعے کے اندر کر لیے۔

میاں اکرم سنبھل کر تخت پر بیٹھ گئے مگر اُن کی آنکھیں وھم سے جا رجٹ کے نقاب سے جا ٹکرائیں۔

بلقیس باتیں کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس پر ایک نامعلوم خوف طاری ہو گیا۔

میاں اکرم کے چہرے پر جمی ہوئی وقت کی دُھول جھُریوں میں لرز لرز کر ننگے سانس لینے لگی اور ساگر کے بیچ کھڑی چٹان پر نہتّے لمحات کا پسینہ تھرتھرانے لگا۔

بلقیس اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آخر اتنی بھی جلدی کیا ہے؟"

"ہٹ جائیے" چٹان نفرت سے گرج کر بولی۔ اور پھر وہ غصّے سے کانپتی ہوئی ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں چلی گئی۔

بلقیس دن بھر روتی رہی۔ نوُری نے گھنٹوں بی بی کا غم بانٹنے کی ناکام کوشش کی۔ نوری جانتی تھی عورت کی خوشی صرف دھن دولت نہیں۔ اُس نے تو خود برسوں پہلے جونکیں لگوا کر فاسد خون نکلوایا تھا۔ اُس نے بی بی کے پاؤں دبائے، کام کاج کیا اور پھر سلام کر کے چلی گئی۔ اُس دن راجو خیر سلّا پوچھنے نہ آئی۔ بلقیس نے سوچا۔ "اُس حرّافہ کو چٹیا سے پکڑ کر آنگن میں نہ گھسیٹوں تو راجپوت کی بیٹی نہیں۔" راجو دوسرے دن بھی نہ آئی۔ تیسرے دن خبر ملی کہ راجو وہ گلی چھوڑ کر کسی دوسرے محلّے میں چلی گئی ہے۔ جاتے جاتے وہ ایک شوشہ چھوڑ گئی جس کی بھنک بلقیس کے کان میں پڑی تو دل پاش پاش

ہو گیا۔ محلّے کی عورتیں اُنگلیاں نچا نچا کر باتیں کرنے لگیں۔ "کمال کو مرے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ اللہ کی سنوار، یہ بلقیس ویدے مٹکاتی میاں اکرم کے ہاں جا پہنچی اور لگی بچارے سیدھے سادے دیندار پر ڈورے ڈالنے۔ توبہ توبہ! آنکھ کا پانی مرگیا ہے۔ پر میاں اکرم نے بھی وہ جُوتا مارا کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔"

ایک ایک کر کے یہ ساری باتیں بلقیس تک پہنچیں۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوج گئیں۔ کوئی میکے سے آتا تو اپنے آنسو چھپا کر وہ مسکراہٹوں کا خول پہن لیتی۔ کوئی پڑوسن آنگن میں قدم رکھتی تو وہ تن کر بات کرتی۔ مقدّمے کا خیال تو اُس نے ذہن سے نکال کر گلی کی نالی میں پھینک دیا۔ ایک تو عدالت نے لمبی تاریخ ڈالی تھی اور پھر وہ خود بھی ایک نامی وکیل سے بات چیت کر کے مطمئن ہو چکی تھی۔ وکیل سے باتیں کرتے ہوئے اُسے رتی بھر اُلجھن نہ ہوئی۔ ہاں وکیل کے رویّے سے اُس نے دل ہی دل میں اپنی سُبکی سمجھی، اس لیے کہ وکیل کی توجہ، واقعات، دستاویزات، قانونی نکات اور معقول فیس پر مرکوز رہی — اُس نے ایک مرتبہ بھی جارجٹ کے نقاب پر نظر نہ ڈالی۔ یہ خیال بلقیس کے ذہن میں اُس وقت شدّت سے اُبھر کر کُھلم کُھلا اُس کے بدن میں چٹکیاں لینے لگا۔ جب آدھی رات کو، پلنگ سے اُٹھ کر وہ یونہی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی اور گلی کے اُس پار، ایک روشن کمرے میں، باریک پردوں کے پیچھے، دو پرچھائیاں کچنار کے گلابی پھولوں کی زبان میں زندگی کی تپش کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور کلمے کی اُنگلی اپنے بائیں بازو پر رکھ کر ایک چٹکی لی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے گوشت کی ایک بوٹی دوسری

بوٹی پر رکھ دی ہو اور بس۔ اُس نے اپنے اُبلتے ہوئے وجود کو پلنگ پر پھینک دیا اور اُس کی سوچ تلوار کی طرح تن کر ایک دوراہے پر کھڑی ہو گئی۔

ایک دن بلقیس کپڑے میں ٹکی مارنے بیٹھی تو سوئی میں تاگا نہ پرو سکی۔ اُسے شبہ ہوا کہ رو رو کر اُس کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ ایک اور وسوسے نے بھی اُسے بے تاب کر دیا۔ "شاید کسے ہوئے گوشت پر سلوٹیں پڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" اُسے یوں محسوس ہوا جیسے آنگن میں کچنار کے گلابی پھول آنسو بہا رہے ہوں۔

نوری کام کرنے آئی تو بلقیس اپنی آنکھوں کا دکھڑا رونے لگی۔

نوری اُنگلی ٹھوڑی پر رکھ کر بولی۔ "بی بی جی میں تو کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں آپ کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی ہے۔"

"ہائے اللہ! کیا میں اندھی ہو جاؤں گی؟" بلقیس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اندھے ہوں بی بی جی کے دشمن۔ ڈاکٹر نگوڑے کیا مر گئے ہیں۔"

بلقیس نے جھٹ برقعہ اوڑھا، توشہ خانے کی چابی نوری کے ہاتھ میں تھمائی اور جھپ جھپ تانگے میں بیٹھ، بات کی بات میں آنکھوں کے ڈاکٹر کے مطب میں جا پہنچی۔ چونکہ بلقیس نے پہلے سے ملاقات کا وقت طے نہیں کر رکھا تھا اس لیے اُسے کافی انتظار کرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے اُس کی باری آئی۔

ڈاکٹر نے بادامی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کی داڑھی مونچھیں صاف

تھیں اس لیے اس کی عمر کا تعیّن کرنا مشکل تھا۔ اُس کی اُبھرواں پھولوں والی گلابی رنگ کی نکٹائی بلقیس کو بہت پسند آئی۔

بلقیس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ایں۔ کوئی تکلیف نہیں۔ جی ہاں، میری نظر کچھ کمزور ہو گئی ہے۔"

ڈاکٹر گھومنے والی کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ڈارک روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اندر تشریف لے چلیے۔"

بلقیس، ڈارک روم میں ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا نقاب اُلٹ دیا۔

اندھیرا سکوت۔ پھولدار کریپ کی قمیص کے اندر دل کی دھائیں دھائیں نے اُودھم مچا دیا۔

برقی قمقمے روشن کر دیئے گئے۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق، بلقیس نے چھ میٹر کے فاصلے سے سنیلن چارٹ پڑھ کر سنایا۔

برقی قمقمے بجھا دیئے گئے۔

ڈاکٹر نے اوپتھیلموسکوپ ہاتھ میں لے کر بلقیس کی آنکھ پر رکھی۔ ڈاکٹر کا چہرہ جھک کر بلقیس کے چہرے کے بالکل قریب آ گیا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں اور بلقیس کی آنکھوں کے درمیان صرف ایک بصری آلہ حائل تھا۔ ڈاکٹر کا تنفّس بلقیس کے رخساروں کو چھو رہا تھا۔

لمحات چنگاریاں بن کر اندھیرے میں بکھرنے لگے۔ بوٹی بوٹی میں کچنار کے پھولوں کا رس بجلی بن کر دوڑنے لگا۔ بلقیس کے ہونٹوں کے کونے لرزنے لگے۔ اُس لرزش کی سُلگتی ہوئی اندھی آگ بڑھ کر ایک لمحے کا فاصلہ طے کرنے لگی۔

ڈاکٹر چونک کر پرے ہٹ گیا اور پھر بجلی کا سوچ دبا کر بولا۔ "کیا بات ہے بیگم صاحب؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"

"باہر تشریف لے چلیئے۔" ڈاکٹر معائنہ ختم کر چکنے کے بعد بولا۔

ڈاکٹر نے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر نسخہ لکھا اور پھر خالص کاروباری انداز میں بولا۔ "سولہ روپے۔"

بلقیس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بٹوا کھولا، سولہ روپے میز پر رکھے اور پھر نسخہ انگلیوں میں مروڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بلقیس گھر پہنچی تو نوری برتن مانجھ رہی تھی۔

"نوری!" بلقیس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چھوڑ دو یہ کام۔ لپک کر جاؤ اور فضلاں کنجڑن کو بلا لاؤ۔ میں جونکیں لگواؤں گی۔"

بُوفے

بلا کی چہل پہل تھی — مرد، عورتیں، بہترین لباس زیبِ تن کیے جِمخانہ چٹاگانگ
کلب کی رومانی فضاؤں میں تیر رہے تھے — کہا جاتا ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے
یہ کلب افرنگیوں کے لیے مخصوص تھا — لیکن وہ تو غلامی کا زمانہ تھا، اب ہم
آزاد ہیں، اب اس کلب میں پاکستانیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب
یہاں ریشمی غراروں، ساٹن کی چمکیلی شلواروں، جارجٹ کی رنگ برنگی ساریوں اور
کالی شیروانیوں کی بہار ہے۔

اس رات ایک وسیع پیمانے پر بُوفے کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ برقی قمقموں
سے جگمگاتے ہوئے بڑے ہال کے وسط میں میزوں پر انواع واقسام کے کھانے
چُنے ہوئے تھے۔ صدر دروازے کے بائیں جانب دیوار سے لگی ہوئی

ایک میز پہ خالی پلیٹیں، چھریاں، کانٹے ترتیب سے دھرے تھے۔ بغلی دروازے کے قریب ایک گول میز پر پانی سے بھرے جگوں اور خالی گلاسوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مقابل کی دیوار سے لگی ہوئی ایک اور میز پر گلدستوں کے اردگرد فرنی اور پڈنگ کی بڑی بڑی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔

کھانے کا اعلان ہوا، اور لوگ گروہ در گروہ اندر آنے لگے۔ چھریوں، کانٹوں اور چمچوں سے کھانے کی میز پہ ہر طرف سے دھاوا بول دیا گیا۔ اُدھر خالی پلیٹوں والی میز پر افراد کا ایک بادل سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ پلیٹیں ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے اور کھانے کی میز تک اُن کی رسائی نہ ہو رہی تھی۔ چند لوگ مجبوراً تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پلیٹوں والی میز تک پہنچتے ہی پہنچتے کھانے کا صفایا ہو جائے گا۔ حفیظ انہی لوگوں میں شامل تھا۔ تنہائی کی تاریکیوں سے نکل کر دفعتاً اس رنگ و بو کی دُنیا میں پہنچ کر وہ متحیر کھڑا تھا۔ پلیٹوں سے چھریاں اور کانٹے ٹکرانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں مچل رہی تھی۔ ہجوم کا یہ عالم کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور روج سے آراستہ نسوانی چہرے انسانوں کے اس ریلے میں چاروں طرف بہتے چلے جا رہے تھے اور حفیظ ابھی پلیٹوں والی میز تک بھی نہ پہنچ پایا تھا۔

گزشتہ اتوار کو حفیظ نے کل پاکستان انجمن خواتین کی ایک رکن سے پانچ روپے میں ایک ٹکٹ خرید لیا تھا۔ بوفے کا انتظام خواتین ہی نے کیا تھا۔ اُس کی طرح اور بے شمار لوگ پانچ روپے کے عوض جیا گانگ کلب کی زیارت کرنے چلے آئے تھے۔ اس ہنگامے کا مقصد فقط انجمن کے لیے روپیہ اکٹھا کرنا تھا اور اس سلسلے

ہیں بُوفے شروع ہونے سے پہلے باہر لان پر قناتوں کے تلے لاٹری ڈال کر بھی کچھ روپیہ سمیٹا جا چکا تھا، برآمدے میں ڈانس کا رنگ رچا کر جیبوں کو ہلکا کر دیا گیا تھا اور چائنا آکشن کے ذریعے بھی خاصی بڑی رقم بٹوری جا چکی تھی۔

اب حفیظ پلیٹ ہاتھ میں تھامے میز کے ارد گرد انسانوں کی متحرک دیوار کے پیچھے کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص خود ہی مہمان ہے اور خود ہی میزبان، کھانے کے ساتھ ساتھ تعارف بھی کرائے جا رہے تھے۔ گفتگو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہو رہی تھی — نقرئی آوازیں، مترنّم قہقہے، چھیڑ چھاڑ، آپس میں ہنسی مذاق، عورتیں نہایت پُرتکلّف انداز میں چُست چُست فقروں سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟" — قبل اس کے کہ حفیظ اچھی طرح سُن پاتا، دو گورے گورے نسوانی ہاتھوں نے ایک تنوری روٹی اور دو شامی کباب اس کی پلیٹ میں رکھ دیئے۔

"آگے بڑھیے صاحب! مرغ سے شوق فرمائیے" — ایک سانولے رنگ کی جوان عورت نے ایک طرف کو ہٹتے ہوئے حفیظ کو دعوت دی۔

وہ میز کے قریب چلا گیا۔ سانولی عورت نے جھٹ شوربے کے دو چمچے حفیظ کی پلیٹ میں ڈال دیئے۔ حفیظ نے شکریہ ادا کیا اور سانولی عورت اپنی سفید جارجٹ کی ساری کمر میں کستے ہوئے ایک انگریز سے باتیں کرنے لگی۔

حفیظ سوچنے لگا کہ کلب کی زندگی ہے تو بڑی دلچسپ؛ یہاں ہر شخص دوسرے سے کھلّم کھلا بات چیت کر سکتا ہے۔ یہاں دو گورے گورے نسوانی ہاتھ بغیر کسی جھجک کے

ایک اجنبی کی پلیٹ میں روٹی اور شامی کباب رکھ سکتے ہیں، یہاں ایک سانولی حسینہ مسکراہٹیں برساتی ہوئی اسے مرغ پیش کر سکتی ہے۔ شاید اس زندگی کو وہی لوگ بُرا سمجھتے ہیں جن کی یہاں تک پہنچ نہیں، مثلاً اگر وہ خود چاہتا بھی تو اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا اس لیے کہ ممبر ہونے کے لیے روپے کی ضرورت تھی اور اس کے اقتصادی حالات اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔

"چٹنی پسند ہے آپ کو؟" پھر انہی گورے گورے ہاتھوں نے حفیظ کی پلیٹ میں ایک چمچہ چٹنی ڈال دی، اور شاید یہ ان ہاتھوں کی آخری پیش کش تھی، اس لیے کہ یہ ہاتھ چلتے پھرتے ہجوم میں گم ہو گئے اور حفیظ سرکتا ہوا پانی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جہاں اُجلی اُجلی وردیاں پہنے ہوئے بیرے کمال پھرتی سے پانی پلا رہے تھے۔

میز کے قریب ہی ایک گوری چٹی دراز قد عورت سپید سپید انگلیوں میں گلاس تھامے ایک ایک گھونٹ کر کے پانی پی رہی تھی اور ایک انگریزی فرم کا منیجر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک قہقہے کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور آئندہ اتوار کو پک نک کا پروگرام طے پا گیا —— حفیظ بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس عورت نے اپنے سفید چہرے پر اس قدر پاؤڈر اور روج کیوں لیپ دئے تھے، اس نے ابرو صاف کر کے ان کی جگہ سیاہ مصنوعی کمانیں کیوں کھینچ ڈالی تھیں۔ حفیظ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس عورت کو برسوں سے گہری نیند نصیب نہیں ہوئی۔ حفیظ نے پلیٹ ایک بیرے کے ہاتھ میں تھما دی، پانی پیا اور پھر دوسروں کے ساتھ بہتا ہوا فرنی اور پڈنگ کی میز پر جا پہنچا۔

"ارے حفیظ! اچھے تو ہو؟" ایک پختہ عمر کے وکیل صاحب نے اس کی

پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"منوّر! تم تو حفیظ کو جانتی ہونا؟ اپنے گاؤں کا ہے، تم دونوں تو ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہو۔" وکیل صاحب نے اسی سانولی عورت سے مخاطب ہو کر کہا جس نے کچھ دیر پہلے حفیظ کو مرغ پیش کیا تھا۔

منوّر نے فرنی سے بھری پلیٹ حفیظ کے ہاتھوں پر رکھ دی اور پھر لانبے لانبے پالش کیے ہوئے ناخنوں والی اُنگلیوں سے ساری کا پلّو تھام کر اونچے کٹے ہوئے سر کے بالوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ وکیل صاحب ان دونوں کے خاندانوں کی تعریفیں کرنے لگے اور حفیظ کی آنکھوں کے سامنے چھوٹی سی منوّر مشرقی بنگال کے ایک دُور افتادہ گاؤں 'کاتی پور' کے کچے راستوں پر گھومنے لگی —— وہی منوّر جو پیلا گمچھا باندھے سرخ کُرتی پہنے پان کے کھیتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کبھی اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ وہی منوّر جو سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر ٹوٹے پھوٹے دیہاتی نغمے گایا کرتی تھی۔ وہی منوّر جو بندریا کی طرح کھجور کے درخت پر چڑھ جاتی اور رس سے بھری ہوئی ٹھلیا کو رسّی سے کھول کر دھم سے زمین پر دے مارتی۔ وہی منوّر جس نے ایک دن کھلیان میں بچّوں کے معصومانہ انداز میں حفیظ سے کہا تھا۔ "مجھ سے شادی کرو گے؟" اور پھر دھان کے ڈھیر میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ آج حفیظ اسی منوّر کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا —— وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔

"تم سچ مچ حفیظ ہو؟" منوّر نے اتنے قریب سے کہا کہ اُس کی سانس حفیظ کے گالوں کو چھُونے لگی۔

"ایں۔ ہاں! تم، منوّر!" حفیظ گویا نیند سے چونک گیا۔

وکیل صاحب کہیں کے کہیں جا پہنچے تھے۔ منوّر اور حفیظ چھوٹی پلیٹیں ہاتھوں میں تھامے پڈنگ والی میز سے کافی دور تھے۔ زندگی کے دو مسافروں کی اچانک پندرہ برس بعد ملاقات ہوئی تھی ـــــ کاتی پور کے ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں سے دور، ایک اونچی پہاڑی پر، چاٹگانگ کلب کے جگمگاتے ہوئے ہال میں، ایک نئی دنیائے رنگ و بو کے بیچ!

"ہیلو، مسز جمیل! آپ تو عید کا چاند ہوگئی ہیں؟" ایک لانبا چوڑا مرد جو شکل و صورت سے پیرِ مغاں معلوم ہوتا تھا، منوّر سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے کلب آنا جو بند کر دیا" ـــــ منوّر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مسز ناصر اچھی تو ہیں ـــــ؟" منوّر نے پوچھا۔

"ابھی یہیں تھیں، کہیں مسٹر جمیل سے رومانس نہ لڑا رہی ہوں۔" پیرِ مغاں نے چٹکلہ چھوڑا، اور پھر آس پاس کے لوگوں نے قہقہے لگا کر اس برجستہ فقرے کی داد دی۔

"مسز جمیل! گھنٹوں سے تمھیں ڈھونڈ رہی ہوں" ـــــ ایک ساٹن کی شلوار والی نے منوّر کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے؟" منوّر نے پوچھا۔

"آئندہ سنیچر ہم شکار کھیلنے دوہزاری جا رہے ہیں۔ وہاں ہرنوں کے غول کے غول ملیں گے، محکمۂ جنگلات کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنے کا انتظام ہو گیا ہے" ـــــ ساٹن کی شلوار والی نے سب کچھ ایک سانس میں کہہ ڈالا۔

"بھئی مجھے تو ہرنوں کا شکار قطعی پسند نہیں" منوّر نے شانے اوپر کو اٹھاتے

ہوئے کہا — "ہرن زخمی ہو کر آنسو بہاتا ہے۔ مجھ سے وہ منظر دیکھا نہیں جاتا اور پھر مجھے تو اڑتے ہوئے سنائپ پہ گولی چلانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

حفیظ کو چار سو زندگی موجیں مارتی نظر آرہی تھی — خوش و خرم چہرے، خوبصورت لباس، گھنگھروں کے چھوٹ، سینٹ کی خوشبو، قہقہے، مسکراہٹیں اور منو رسے ایک عرصۂ دراز کے بعد اچانک ملاقات ہو جانے سے تو اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس نے صدیوں کی کھوئی ہوئی زندگی از سرِ نو پالی ہو۔

ہجوم کے رُخ کے ساتھ ساتھ وہ بھی صدر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی پلیٹ میز پہ رکھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ من چلے نوجوان کرسیوں پہ بیٹھے سگریٹ کے کش لگا لگا کر ہوا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بنا رہے تھے۔ یارانِ طریقت پر جھاڑتے ہوئے ڈائس ٹیبل کی طرف اُمڈے چلے آرہے تھے۔ ایک گھسا ہوا ممبر ڈائس ٹیبل پر پانسے الٹ پلٹ کرتا ہوا "ٹرائی یور لک" کی صدائیں لگا رہا تھا۔ دو قدم پرے ایک مرد ڈنر سوٹ پہنے ہوئے ایک یورپین لیڈی سے باتیں کر رہا تھا۔ مرد بایاں ہاتھ برآمدے کے ستون سے ٹیکے، دائیں ہاتھ سے دانتوں میں پائپ دبائے دھوئیں کے بادل اُڑا رہا تھا۔ یورپین لیڈی کے ایک ہاتھ میں شیری سے لبریز جام اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ کبھی وہ شیری کی ایک چسکی لگا لیتی اور کبھی سگریٹ کا ایک کش۔

"مسٹر جمیل! نمبر چار خالی ہے" — ڈائس کھلوانے والے نے ڈنر سوٹ پہنے ہوئے مرد کو داؤں لگانے کی دعوت دی۔

"شکریہ! مجھے اس سے دلچسپی نہیں" — مسٹر جمیل نے پائپ کو دانتوں کی گرفت سے علیحدہ کر کے جواب دیا۔

"جمیل صاحب! تو آئیے، پھر دل ہی کی بازی سہی"۔ قریب ہی سے ایک خاتون نے شاعرانہ انداز میں مصرع طرح چھوڑا۔ اس پر ڈائس کھلوانے والے نے استادانہ رنگ میں طبع آزمائی کی، اور پھر ایک ٹھنگنی عورت نے ایڑیاں اٹھا کر ایسی گرہ لگائی کہ ڈائس ٹیبل کے اردگرد قہقہوں پر قہقہے بلند ہونے لگے۔ مسٹر جمیل مسکرائے اور پھر پائپ دانتوں میں دبا کر دھوئیں کے حلقے ہوا میں اُڑانے لگے۔ گولڈ فلیک کے خالی ٹین میں پانسے زور زور سے ہلا کر میز پر پھینک دئے گئے۔ ایک شور ہوا، کوئی جیتا، کوئی ہارا۔

حفیظ ڈائس ٹیبل کے قریب کھڑا دیکھ رہا تھا — سُن رہا تھا — سوچ رہا تھا۔

"حفیظ!" دفعتاً عقب سے منوّر نے حفیظ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔ اور قبل اس کے کہ حفیظ کے ہونٹ ہلتے، منوّر اسے بازو سے پکڑ کر مسٹر جمیل کے پاس جا پہنچی، جو مسز ہیملٹن سے باتیں کر رہے تھے۔

"جمیل! آپ سے ملیے — یہ ہیں میرے پرانے دوست مسٹر حفیظ۔ مسز ہیملٹن!"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ — جمیل نے حفیظ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت خوشی ہوئی"۔ مسز ہیملٹن نے چٹکی سے جلتے ہوئے سگریٹ کو ہوا میں اچھال کر حفیظ سے ہاتھ ملایا۔

"حفیظ میرے بچپن کے ساتھی ہیں، آج میں بہت خوش ہوں، برسوں کے بعد ہماری اچانک ملاقات ہوئی ہے"۔ — منوّر نے ہوا میں اس انداز سے باہیں پھیلاتے ہوئے کہا کہ جیسے وہ ابھی حفیظ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے گی۔

حفیظ ایک عجیب بیچارگی کے عالم میں تھا، جیسے ابھی کوئی اس پر وار کر بیٹھے گا۔ اگر جمیل اس سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کا کیا شغل ہے تو پھر؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے

باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"جمیل! کل رات حفیظ ہمارے یہاں کھانا کھائے گا" — منوّر نے حفیظ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"مسز ہیملٹن! معاف کیجئے گا، جمیل! اب میں حفیظ کے ساتھ وہاں بنچ پر بیٹھ کر باتیں کروں گی" — منوّر نے باہر قناتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر حفیظ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اُدھر بڑھ گئی۔

بال روم میں مردوں اور عورتوں کے جوڑے والز کے دھیمے دھیمے سروں پر رقص کر رہے تھے۔ ڈانس ٹیبل پر سکوں اور نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ بٹلر نہایت مستعدی کے ساتھ چھوٹے بڑے پیگ تقسیم کر رہے تھے۔ جمیل بدستور پائپ دانتوں میں دبائے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اُڑا رہا تھا۔ مسز ہیملٹن بال روم میں پہنچ چکی تھیں، اور اب ایک فربہ عورت جمیل کو گزشتہ شب کی برج اور پوکر کے دلچسپ قصے سُنا رہی تھی۔

"حفیظ! آج میں بہت خوش ہوں" — منوّر نے حفیظ کے پاس بنچ پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی۔

حفیظ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک طویل مدّت کے بعد منوّر سے اچانک اور اس ماحول میں ملاقات ہو جانے پر اس کے دل میں جہاں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، وہاں اضطراب کا ایک طوفان بھی موجزن تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھ چوری کے لیے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

"تم چُپ کیوں ہو؟" — منوّر نے حفیظ سے اور قریب ہو کر پوچھا۔

"منوّر!" — حفیظ نے ایک عجیب گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "میں ڈر رہا ہوں۔"

منوّر کھلکھلا کر ہنس پڑی، حفیظؔ کھسیانا سا ہو گیا — "تم ڈر رہے ہو؟ آخر کیوں؟" منوّر نے پرے سرکتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

اتنے میں ایک میم اور صاحب کا جوڑا، باہوں میں باہیں ڈالے، ہلکے ہلکے قدم رکھتا ہوا، بنچ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ "سکاچ اور تمہارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" صاحب نے تیز سانسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا۔ اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے ننگے سڈول بازوؤں پہ رینگتا ہوا، نکلس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔

حفیظؔ کو یک بیک محسوس ہوا کہ لعل و گہر کے بے بہا خزینوں کو لوٹ لینے کے لیے اس کے ہاتھوں میں نئی قوت عود کر آئی ہے "منوّر —!" حفیظؔ نے منوّر کی ساری کے پلّو کو دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"شاید تم بدل گئے ہو" منوّر بولی — "جب ہم پان کے کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے تو کسی کو ڈر نہ لگتا تھا" — منوّر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہو گیا ہے؟ یہی نا کہ ہم جوان ہو گئے ہیں، تو پھر کیا ہوا؟ کیا ہم اب ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی نہیں کر سکتے؟" — منوّر کے اندازِ گفتگو میں محبت تھی معصومیت تھی، خلوص کی مہک تھی۔

جیسے کسی نے حفیظؔ کے شانے پکڑ کر اسے زور سے جھنجھوڑ دیا ہو، اس کے دل کا اضطراب آناً فاناً کافور ہو گیا۔ "منوّر! آج میں بہت خوش ہوں!" وہ دفعتاً پکار اُٹھا۔

"اور ڈر بھی رہے ہو؟ منوّر نے پھر قریب سرکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، اب میں صرف خوش ہوں" — حفیظؔ نے پہلی مرتبہ جوان منوّر کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا ——اُن دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کالی پور کی حسین وادیاں مسکرا رہی تھیں۔

ڈائس ٹیبل سے نمبر ۳ کا نعرہ بلند ہو کر رمبا ناچ کی شورشوں میں گم ہو گیا۔ بال روم میں انسانی خون تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ قدموں میں لغزشیں آنے لگی تھیں۔ زبانیں آداب محفل کی قیدوں سے آزاد ہوتی جا رہی تھیں۔

"جینا تو یہ لوگ جانتے ہیں" —حفیظ نے ناچنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، یوں کہو کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا جانتے ہیں" ——منوّر نے بنچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" حفیظ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ان میں شاید ہی کوئی خوش ہو" ——منوّر نے آہستہ سے کہا، جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو —— "میری ہی مثال لے لو، میں امیر ہوں، لیکن مجھ سا غریب کوئی نہیں" ——منوّر دا ہنے ہاتھ کو پیشانی پر رکھے یوں بول رہی تھی، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

حفیظ سوچنے لگا کہ منوّر کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ کلب کی پُر کیف زندگی، موٹر کاریں، شاندار بنگلے، رمبا ناچ، ننگے سڈول بازوؤں پر رینگتے ہوئے ہاتھ، اگر یہ لوگ بھی خوش نہیں تو کون خوش ہے؟

"شاید اس دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں، اور اگر خوش ہے تو وہ خوشی کی حقیقت سے واقف نہیں" ——منوّر نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے ایک

جماہی لی۔

"منوّر! میں تمھاری باتیں نہیں سمجھ سکا"۔ حفیظؔ نے نہایت سادگی سے کہا۔

"نمبر ایک، نمبر ایک' وہ مارا"۔ ڈائس ٹیبل سے شور بلند ہوا۔

"حفیظؔ!" منوّرؔ نے حفیظؔ کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو نمبر ایک انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے؟"

حفیظؔ خاموش رہا۔ "خدا ایک ہے' انسان کا دل ایک ہے' محبت ایک ہے"۔ منوّرؔ نے رُک رُک کر کہا۔

یکا یک جیسے فضا میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا' اور کلب کی تیزی سے دوڑتی ہوئی زندگی نے ایک جھپکی سی لے لی۔ حفیظؔ کا ہاتھ اس کے پرانے کوٹ کی جیب میں سکّے ٹٹولنے لگا۔ ایک' دو' تین — اٹھنی' چونی' دونی — اسی میں کل کا ناشتہ اور دن کا کھانا — اتنے میں پہلے والا صاحب ایک دوسری میم کی بغل میں ہاتھ ڈالے لڑکھڑاتا ہوا پھر بینچ سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک گیا۔

"سکاچ اور تمھارے بغیر میں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔ اُس نے پھر تیز سانسوں کو مجتمع کر کے ڈرامائی انداز میں کہا۔ اور پھر اس کا ایک ہاتھ میم کے ننگے شانوں پر رینگتا ہوا اس کے سنہرے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"حفیظ! تمھیں یاد ہو گا" — منوّرؔ بولی۔ "جب میں سپاری اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی' تو تم چپ چاپ بیٹھے سُنا کرتے تھے۔ تمھارے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ جب تم بولتے تھے تو میں گانا بند کر دیتی تھی۔ چپ سادھنا شاید تمھاری عادت ہو گئی ہے' مگر آج میں گا تو

نہیں رہی ہوں۔"

"تمھاری باتوں میں بھی میرے لیے گیتوں کا رس ہے۔" حفیظ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہ جانے کیوں" — منوّر نے بھرّائی ہوئی آواز سے کچھ کہنا چاہا — حفیظ حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔

"بس صرف تمھیں بتا دینا چاہتی ہوں" — منوّر نے بیحد درد انگیز آواز میں کہا۔

"کیا؟" — حفیظ گھبرا گیا۔

"میری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چکر کاٹ رہی ہے" — منوّر نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "مجھے ہر روز وقت پر ناشتہ کرنا ہوتا ہے، دن کے ٹھیک ایک بجے لنچ، ٹھیک چار بجے شام کی چائے — ٹھیک نو بجے رات کا کھانا، اور پھر ایک معیّن وقت پر چاچا تُلا، ٹھنڈا، مکینکل، خاوند کا پیار، برتھ ڈے پر پھولوں کے ساتھ قیمتی تحفے، ہر عید پر ایک جڑاؤ زیور!"

"منوّر!" ایک آواز آئی، مسٹر جمیل سامنے کھڑے رسٹ واچ کی سوئیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ "ہمیں پندرہ منٹ میں گھر پہنچ جانا چاہیے۔" جمیل صاحب نے کہا۔

لوگ بار سے جھومتے جھامتے باہر نکل رہے تھے۔

بال روم میں ایک عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈانس ٹیبل پر آمدے

سے ہٹائی جا چکی تھی۔ تمام مرد اور عورتیں کلب کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے ——۔ مسٹر اور مسز جمیل خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ حفیظ اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے سوچ رہا تھا کہ اتنی رونق، چہل پہل اور گہما گہمی کے ٹھیک بعد تیزی سے چھاتی ہوئی خاموشی کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے دو گورے گورے ہاتھ، تنوری روٹی اور شامی کباب تھامے رقص کرنے لگے، اسے پھر ایک سانولی حسینہ مرغ پیش کرتی نظر آئی۔

کاش وہ اب بھی اُڑ کر کالی پور پہنچ سکتا، اور وہاں کی مسکراتی ہوئی وادیوں کو منوّر کی دُکھ بھری داستان سُنا سکتا ——!